اتر پردیش اردو اکادمی
انیسیات
سید مسعود حسن رضوی ادیب
میر ظہیر عباس روستمانی
اتر پردیش اردو اکادمی، لکھنؤ

سلسلۂ مطبوعات اترپردیش اردو مطبوعات ۔ ۱

پہلا اڈیشن نومبر ۱۹۷۶ء
دوسرا اڈیشن اکتوبر ۱۹۸۱ء

انیسیات

میر انیس پر مضامین و مقالات

۱-۹

مصنف: پروفیسر سید مسعود حسن رضوی ادیب

مرتّبہ: صباح الدین عمر

ناشر: اترپردیش اردو اکادمی

قیمت: سات روپے مجلّد دش روپے

عزیز الجبار خاں، سکریٹری اترپردیش اردو اکادمی نے سود لیتھو پریس (آفسیٹ ڈویژن) اوکھلا، نئی دہلی سے طبع کرواکے ۲۱۔ آر۔ کے ٹنڈن روڈ، قیصر باغ، لکھنؤ سے شائع کیا۔

دیباچہ

شبلی سے لے کر امداد امام اثر تک اور امداد امام اثر سے جمیل مظہری تک میر انیسؔ کے فکر و فن پر اظہارِ خیال کرنے والوں کی فہرست خاصی طویل ہے لیکن سچ بات یہ ہے کہ انیس شناسی ہر ایک کے بس کی بات نہیں، انیسؔ کا جوہر صرف ان لوگوں پر کھلتا ہے جنھوں نے ان کے کلام کا حرف بہ حرف مطالعہ کیا ہو اور جو نقد الشعر کے قدیم و جدید تقاضوں سے واقف ہوں۔ یہ کون نہیں جانتا کہ اس امرِ خاص میں ایک معتبر نام پروفیسر مسعود حسن رضوی ادیب مرحوم کا ہے۔

اتر پردیش اردو اکادمی کو اس کا فخر حاصل ہے کہ اس نے اپنا سلسلۂ مطبوعات مرحوم کے مجموعۂ مضامین "انیسیات" سے شروع کیا جسے حسنِ قبول حاصل ہوا اور پہلا اڈیشن بہت جلد ختم ہو گیا۔ اکادمی اب اپنی بعض مطبوعات کو دوبارہ شائع کر رہی ہے۔ مزید فخر کی بات یہ ہے کہ اشاعتِ ثانی کا یہ سلسلہ بھی "انیسیات" سے شروع ہو رہا ہے۔

اتر پردیش اردو اکادمی
لکھنؤ
اگست ۱۹۸۱ء

محمود الٰہی
(چیرمین)

عرض ناشر

اتر پردیش اردو اکاڈمی کے اغراض و مقاصد میں مختلف موضوعات پر اردو کی کتابیں شائع کرنا بھی ہے۔ اس مقصد کی تکمیل کے لیے ایک سہ سالہ اشاعتی منصوبہ بھی اکاڈمی کے زیر غور ہے۔ اس منصوبے میں طبع زاد کتابوں، ترجموں، اردو کے قدیم شاہ کاروں اور یونیورسٹی سطح کے درسی نصاب کی اشاعت شامل ہے۔ اکاڈمی نے فی الحال مختلف موضوعات پر گیارہ مسودوں کی اشاعت منظور کی ہے۔ پیش نظر کتاب انیسیات اسی سلسلے کی پہلی کڑی ہے۔

اتر پردیش اردو اکاڈمی کی مجلس انتظامیہ نے تقریباً دو برس ہوئے، یہ طے کیا کہ میر انیس پر جنھوں نے اردو کی ایک مخصوص صنف سخن "مرثیہ" کو درجۂ کمال تک پہنچا کر عالمی ادب میں ایک منفرد و ممتاز مقام حاصل کر لیا ہے، ماہر انیسیات پروفیسر سید مسعود حسن رضوی ادیب کے وقتاً فوقتاً شائع ہونے والے مضامین یک جا کر کے کتابی صورت میں شائع کیے جائیں۔ میں اس سلسلے میں پروفیسر صاحب مرحوم سے ملا اور انھوں نے میر انیس پر اپنے مختلف مطبوعہ مضامین تلاش کر کے میرے حوالے کر دیے۔ میں نے ان مضامین کو ترتیب دے کر ان کے سامنے پیش کیا اور اس خیال سے کہ کتاب اپنی جگہ مکمل اور میر انیس کی زندگی، شخصیت اور شاعری کے تقریباً ہر پہلو کی آئینہ دار ہو، ان سے درخواست کی کہ وہ ایک مختصر مضمون خاص طور سے اس مجموعے کے لیے بھی تحریر فرما دیں۔ انھوں نے یہ مضمون تو لکھ دیے لیکن یہ بھی فرمایا کہ میر انیس پر ایک جامع کتاب کی ضرورت ہے اور میرا ارادہ اسے تیار کرنے کا ہے، لیکن اس میں کافی وقت لگے گا۔

پروفیسر مسعود حسن رضوی ادیب کے ان مضامین کے علاوہ میر انیس سے متعلق ان کی تین کتابیں شاہ کار انیس، روح انیس اور رزم نامۂ انیس اس سے قبل شائع ہو چکی ہیں۔ یہ تینوں کتابیں انتخاب کلام انیس پر مشتمل ہیں۔ ان میں میر انیس کا تعارف

اوران کے کلام پر تبصرہ اختصار کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ میر انیس کے اسلاف کے حالات بھی انھوں نے اپنی ایک کتاب اسلافِ میر انیس میں درج کر دیے ہیں۔ لیکن پیش نظر کتاب انیسیات ایک جداگانہ حیثیت رکھتی ہے اور اس میں میر انیس کی زندگی شخصیت اور فن کے مختلف پہلو سامنے آجاتے ہیں۔

کتاب کا مسودہ تیار ہو جانے کے بعد پروفیسر صاحب مرحوم نے مصنف، مرتب، ناشر کے نام ایک الگ کاغذ پر لکھ دیے تھے اور تحریری طور سے اصرار کیا کہ کتاب کا انر ٹائٹل اسی طرح رکھا جائے۔ مرحوم کی خواہش کا احترام کرتے ہوئے اور اس خیال سے بھی کہ ان کا عکس تحریر شامل کتاب ہو جائے، کتاب کا "انر ٹائٹل" ان کی تحریر سے مزین کیا جا رہا ہے۔

انیسیات میں مندرج مضامین ۱۹۲۶ء سے ۱۹۷۲ء کے دوران شائع ہوئے ہیں۔ مضامین کی ترتیب میں اس بات کا خیال رکھا گیا ہے کہ حیات اور شخصیت سے متعلق مضامین پہلے اور فن سے متعلق مضامین بعد میں آئیں۔ ہر مضمون کے شروع میں ایک فٹ نوٹ دے دیا گیا ہے جس میں ماخذ کا نام اور سنِ اشاعت لکھ دیا گیا ہے۔

کتاب کے بعض مضامین میں کچھ ایسے حضرات کا حوالہ ہے جو مضمون لکھتے وقت زندہ تھے۔ میرا ارادہ تھا کہ ان کے بارے میں پروفیسر صاحب سے کچھ اور معلومات حاصل کر لی جائیں، یا یہ معلوم کر لیا جائے کہ ان کا انتقال کب ہوا۔ لیکن مسعود صاحب ۱۹۷۵ء میں ایسے بیمار پڑے کہ پھر ان سے اس سلسلے میں بات کرنے کا کوئی سوال ہی نہ رہ گیا۔ یہ اتفاق ہے کہ پروفیسر سید مسعود حسن رضوی ادیب کا انتقال بھی ماہ نومبر (۱۹۷۵ء) میں ہوا اور انیسیات بھی ماہ نومبر ۱۹۷۶ء ہی میں شائع ہو رہی ہے۔

اتر پردیش اردو اکاڈمی اور اس کی یہ پہلی کتاب دونوں اس لحاظ سے خوش نصیب ہیں کہ موخرالذکر کی رسمِ اجرا صدر جمہوریہ ہند عالی جناب فخرالدین علی احمد کے دستِ مبارک سے انجام پا رہی ہے۔ میر انیس جیسے عظیم شاعر پر پروفیسر سید مسعود حسن رضوی ادیب جیسے عظیم محقق کی لکھی ہوئی کتاب یقیناً اس بات کی مستحق تھی کہ اس کی رسمِ اجرا ملک کی سب سے بڑی ہستی کے ہاتھوں ادا ہو، جو صرف صدر جمہوریہ ہند ہی نہیں بلکہ اردو کا بہت بڑا دوست اور سرپرست بھی ہے۔

لکھنؤ: صباح الدین عمر
۱۶ر نومبر ۱۹۷۶ء سکریٹری اتر پردیش اردو اکاڈمی

عنوانات

میر انیس: مختصر تعارف

میر انیس خاندانی شاعر تھے۔ ان کے خاندان میں شاعری کئی پشتوں سے چلی آتی تھی، ان کے مورث اعلیٰ میر امامی شاہجہاں کے عہد سلطنت میں ایران سے ہندوستان آئے اور اپنے علم و فضل کی بہ دولت سہ ہزاری ذات کے منصب پر فائز ہوئے۔ وہ طبیعت کی موزونی سے کبھی کبھی شعر بھی کہتے تھے۔ ان کی زبان فارسی تھی لیکن دہلی کے مستقل قیام سے وہ ہندوستانی زبان سے متاثر ہوتی رہی اور دو نسلوں کے بعد ان کی اولاد کی زبان دہلی کی فصیح و شستہ اردو ہوگئی۔ ان کے پردتے میر ضاحک اردو کے صاحب دیوان شاعر ہوئے۔ ذیل کے دو شعروں سے ان کی زبان کا اندازہ کیا جا سکتا ہے ؎

در پیش اگر روز اجل آہ نہ ہوتا قصہ تھا محبت کا، یہ کوتاہ نہ ہوتا

کیا دیکھیے اصلاح خدائی کو دگرنہ کافی تھا ترا حسن اگر ماہ نہ ہوتا

ذیل کی رباعی بتاتی ہے کہ ان کو فارسی زبان پر بھی عبور حاصل تھا ؎

فریاد دلا! کہ غم گساراں رفتند سیمیں بدنان و گل عذاراں رفتند

چوں بوئے گل آمدند بر باد سوار در خاک چو قطرہ ہائے باراں رفتند

میر ضاحک اور مرزا سودا میں جو ہجو بازی ہوتی رہتی تھی، اس کا ذکر تقریباً ہر تذکرہ نویس نے کیا ہے۔

میر ضاحک کے فرزند میر حسن دہلی میں پیدا ہوئے اور جوانی میں اپنے والد کے ساتھ فیض آباد چلے گئے۔ جب نواب آصف الدولہ نے فیض آباد کی جگہ لکھنؤ کو اپنا دار الحکومت قرار دیا تو میر حسن لکھنؤ چلے آئے۔ ان کا انتقال یکم محرم ۱۲۰۱ھ کو ہوا۔ اردو میں سیکڑوں مثنویاں لکھی گئیں لیکن میر حسن کی مثنوی سحر البیان

کا جواب نہ ہو سکا۔ وہ غزل بھی بہت اچھی کہتے تھے۔ ان کی ایک غزل کے تین شعر سنیے ۔

مجھ میں اور دل میں سدا ہے سبق عشق کا درس
میں سناتا ہوں اسے اور وہ سناتا ہے مجھے
یاد میں کس کی کروں، مجھ کو کہاں ہوش و حواس
اپنی ہی یاد سے یہ عشق بھلاتا ہے مجھے
اتنا معلوم تو ہوتا ہے کہ جاتا ہوں کہیں
کوئی مجھ میں ہے کہ مجھ سے لیے جاتا ہے مجھے

میر حسن کے تین بیٹے خلق، خلیق اور مخلوق شاعر تھے۔ خلق اور خلیق صاحب دیوان تھے۔

میر انیس کے والد میر مستحسن خلیق فیض آباد میں پیدا ہوئے اور آخر عمر میں لکھنؤ چلے آئے۔ سولہ برس کی عمر سے شعر کہنے لگے۔ میر حسن نے ان کے کلام کی اصلاح شیخ مصحفی سے متعلق کر دی۔ انھوں نے غزلوں کا ایک پورا دیوان کہہ ڈالا۔ بعد کو مرثیہ گوئی کی طرف توجہ کی اور آخر عمر تک اسی شغل میں مصروف رہے۔ خلیق غزل گوئی کے میدان میں کچھ زیادہ نہ چمکے، مگر مرثیہ گوئی نے ان کا نام خوب روشن کیا۔

شبلی نے موازنۂ انیس و دبیر میں، عبدالسلام نے شعر الہند میں، حامد حسن قادری نے تاریخ مرثیہ گوئی میں اور ابواللیث صدیقی نے لکھنؤ کا دبستانِ شاعری میں لکھا ہے کہ خلیق کے مرثیے دستیاب نہیں ہوتے۔ لیکن میرے عظیم ذخیرۂ مراثی میں خلیق کے پونے دو سو مرثیے موجود ہیں۔

میر خلیق کے ہم عصروں میں تین مرثیہ گو اور بھی تھے یعنی میر ضمیر، میاں دلگیر اور مرزا فصیح۔ خلیق کا پایہ مرثیہ گوئی میں کسی سے نیچا نہ تھا، اور مرثیہ خوانی میں سب سے اونچا تھا۔ وہ جب مرثیہ پڑھتے تھے تو چشم و ابرو کے اشاروں، اعضا کے مناسب حرکات سے اور آواز کے اتار چڑھاؤ سے مضامین کی تصویر کھینچ دیتے تھے۔ ۱۲۶۰ھ میں ان کا انتقال ہوا۔

میر خلیق کے تین بیٹے تھے۔ انیس، انس، مونس۔ تینوں بلند پایہ شاعر

اور نامور مرثیہ گو ہوئے۔ لیکن میر انیس نے مرثیے کو اس بلندی پر پہنچا دیا جہاں کسی دوسرے شاعر کی رسائی ممکن نہ ہوئی۔

میر انیس اپنی وضع اور اپنے اوقات کے بہت پابند تھے۔ ورزش کا شوق تھا۔ شہسواری، شمشیرزنی، بنوٹ وغیرہ میں مشاق تھے۔ ان کا قد میانہ مائل بہ درازی تھا۔ ورزش کی وجہ سے جسم ٹھوس اور اعضا چست و متناسب تھے۔ چھریرا بدن، چوڑا سینہ، صراحی دار گردن، خوبصورت کتابی چہرہ، بڑی بڑی آنکھیں اور گیہواں رنگ تھا۔ مونچھیں ذرا بڑی رکھتے تھے اور داڑھی اتنی باریک کترواتے تھے کہ دور سے منڈی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔

میر صاحب نہایت وضع دار آدمی تھے۔ حباب کی شکل کی چوگوشیا ٹوپی، نیچا گھیردار کرتا، ڈھیلی مہری کا پائجامہ اور گھیتلا جوتا بالعموم پہنتے تھے۔ ان کے زمانے کے ذی علم اور ثقہ، شرفا اور صلحا کا یہی لباس تھا۔ ہاتھ میں چھڑی اور رومال بھی ضرور ہوتا تھا۔

میر انیس کے پردادا میر ضاحک، دادا میر حسن، والد میر خلیق اور دو چچا میر خلق اور میر مخلوق سب شاعر تھے۔ اس طرح میر انیس کو شاعری اپنے بزرگوں سے میراث میں ملی تھی اور ان کی نشوونما شاعری کی فضا میں ہوئی تھی۔

میر انیس کا آبائی اور خاندانی مذہب شیعہ تھا۔ خدا کی خدائی اور محمد کی پیغمبری کے تو سب مسلمان قائل ہیں لیکن پیغمبر کی وفات کے بعد ان کی جانشینی کے سلسلے میں کچھ اختلاف پیدا ہو گیا جس نے مسلمانوں کو دو بڑے گروہوں میں تقسیم کر دیا جو شیعہ اور سنی کے ناموں سے مشہور ہیں۔ شیعوں کے خیال میں رسول کے پہلے خلیفہ یعنی روحانی جانشین ان کے چچازاد بھائی اور داماد حضرت علی تھے۔ ان کے بعد خلافت انھیں کی اولاد میں نسلاً بعد نسل منتقل ہوتی رہی۔ رسول کے یہ جانشین جن کی تعداد بارہ ہے 'امام' کہلاتے ہیں۔

خوش عقیدہ شیعوں کے نزدیک اماموں کو ظاہری موت کے بعد بھی ابدی زندگی حاصل ہے۔ معجزہ یعنی خرقِ عادت ہر وقت ان کے امکان میں ہے۔ ان کی دعا سے مریض تندرست اور مردے زندہ ہو سکتے ہیں۔ اصولاً سب

اماموں کا مرتبہ برابر ہے۔ لیکن شیعوں کے دل میں پہلے امام حضرت علی کی جس قدر عظمت ہے اور تیسرے امام حضرت حسین ابن علی کی جتنی محبت ہے اتنی کسی اور کی نہیں ہے۔ انھیں امام حسین کو بادشاہ وقت یزید کی فوج نے انتہائی سنگدلی اور بے رحمی سے تین دن کی بھوک اور پیاس میں تمام عزیزوں اور رفیقوں سمیت کربلا کے میدان میں شہید کر دیا۔ کربلا کا یہی المیہ مراثی انیس کا خاص موضوع ہے۔

میر انیسؔ کی علمی استعداد

شیخ محمد جان عروجؔ فیض آبادی ایک ذی علم شاعر اور نظم و نثر کی چند کتابوں کے مصنف تھے۔ مرثیہ بھی کہتے تھے۔ میر انیسؔ اور مرزا دبیرؔ دونوں کو خدائے سخنوری مانتے تھے اور دونوں کی ہم نشینی کا شرف بھی رکھتے تھے۔ ان کا بیان ہے:

"میر صاحب قبلہ (میر انیسؔ) کی حیثیت علمی ما یحتاج اعلیٰ درجے کی تھی[1]۔"

خان بہادر میر علی محمد شادؔ عظیم آبادی کی قابلیت و وسعت نظر، قوتِ شاعری اور کثرت تصانیف کا حال کس کو معلوم نہیں۔ مرزا دبیرؔ سے بہ خوبی واقفیت اور عقیدت رکھتے تھے۔ میر انیسؔ کی زیارت اور ہم کلامی کا فخر بھی حاصل تھا۔ لکھتے ہیں:-

"میر صاحب مرحوم عربی و فارسی زبان سے بھی بہت اچھی طرح واقف اور شاعری کے سب فنون میں طاق تھے۔ اُن کو اُستادوں کے کلام اس قدر یاد تھے کہ ایک مثال کے لیے کئی کئی شعر پڑھ دیتے تھے[2]۔"

سید امجد علی اشہری نے انھیں شادؔ مرحوم کے ایک خط کے حوالے سے لکھا ہے کہ ایک مرتبہ فلسفے کی مشہور درسی کتاب صدرا کی ایک عبارت پر بحث ہو رہی تھی۔ میر انیسؔ سے استصواب کیا گیا۔ انھوں نے وہ عبارت زبانی پڑھ دی اور اس مشکل مقام کو اس خوبی سے حل کر دیا کہ سننے والے دنگ رہ گئے۔ یہ بھی لکھا ہے:-

"لکھنؤ میں میر انیسؔ کو عالمانہ درجے میں تسلیم نہیں کیا جاتا۔ لیکن ان

مطبوعہ ماہنامہ ادب، لکھنؤ۔ جنوری ۱۹۳۱ء

[1] تردید موازنہ صفحہ ۱۰۔ [2] نوائے وطن صفحہ ۳۴۔

کی معلومات علمیہ کا سب کو اقرار ہے ...... میر صاحب کو بہ نسبت منقولات کے معقولات سے زیادہ دلچسپی تھی ...... میر صاحب کی مختصر لائبریری میں علم و فن کی ضروری کتابیں جمع تھیں جو سب کی سب ان کی نظر سے گزر چکی تھیں[1]۔"

مولانا علی حیدر صاحب نظم طباطبائی تحریر فرماتے ہیں:۔

"میر صاحب کے کلام سے اتنا تو معلوم ہوتا ہے کہ علوم متعارفہ سے ناواقف بھی نہ تھے[2]۔"

میر انیس کے حقیقی نواسے میر سید علی صاحب مانوس جو سید صاحب کے نام سے معروف ہیں اور نو دس برس کے سن سے پچیس چھبیس برس کی عمر تک میر انیس کے ساتھ رہے، ان کا بیان ہے کہ میر انیس کے کتب خانے میں کوئی دو ہزار کتابیں ہوں گی۔ دو بڑے بڑے صندوق کتابوں سے بھرے ہوئے تھے۔ ان کو خوب یاد ہے کہ غدر کے بعد میر انیس نے شاہنامہ فردوسی کا ایک عمدہ نسخہ مطلا، مصور، بخط ولایت دو سو روپے کا خریدا تھا۔

راقم مضمون نے بھی میر انیس کے کتب خانے کی ایک کتاب کی زیارت کی ہے یعنی نفس اللغتہ جس کا ایک حصہ خود میر انیس کے ہاتھ کا نقل کیا ہوا ہے۔ یہ لغت خاندانِ انیس کے ایک ممتاز رکن سید ظفر حسین صاحب عرف بابو صاحب فائق کے پاس موجود ہے[3]۔ جناب مانوس کا بیان ہے کہ "غدر کے بعد جس زمانے میں میر انیس کا قیام پنجابی ٹولہ میں تھا، تو وہیں اس کتاب کو نقل کیا کرتے تھے۔"

مندرجۂ بالا مختصر بیانات کے علاوہ میر انیس کی علمی استعداد کا حال میری نظر سے نہیں گزرا۔ لیکن ان کی تصنیفیں اور تحریریں، ان کی قابلیت اور معلومات کی وسعت پر شہادت دے رہی ہیں۔ میر انیس کو فطرت نے ذوق سلیم عطا کیا تھا وہ جانتے تھے کہ اظہار قابلیت کی ہوس ادبیت کی دشمن ہے۔ اس لیے وہ بڑے بڑے

---

[1] حیات انیس صفحہ ۲۰۔۱۹۔ [2] مراثی انیس جلد دوم، مرتبہ حضرت نظم طباطبائی، مطبوعہ نظامی پریس بدایوں صفحہ ۵۲۰۔ [3] اب یہ لغت جناب فائق کے فرزند سید اصغر حسین کے پاس کراچی میں موجود ہے۔

ات، غیر مانوس ترکیبیں، عربیت اور فارسیت کا غلبہ، اصطلاحات علمیہ، مسائلِ علمیہ، ان چیزوں سے لوگوں پر اپنی قابلیت کا دباؤ ڈالنا اور ادبیت کا خون کرنا پسند کرتے تھے۔ ان کو جیسے جیسے زبان پر قدرت، نظم کی مشق اور ادبیت میں پختگی حاصل ہوتی گئی اتنا ہی ان کی کتابی معلومات کا اظہار ان کے کلام میں کم ہوتا گیا۔ چنانچہ علمیت اور عربیت جس قدر ان کے ابتدائی کلام میں ہے آخری کلام میں نہیں ہے۔

انیس کی علمی استعداد کے بارے میں میں ان کے کلام سے جو کچھ اخذ کر سکا ہوں وہ ذیل میں دفعہ وار لکھتا ہوں۔

(۱) میر انیس عربی زبان بخوبی جانتے تھے۔ اس دعوے کی دلیلیں یہ ہیں:-

(۱) وہ اپنے کلام میں عربی لفظ، فقرے، محاورے اور ترکیبیں بے تکلف اور برمحل استعمال کرتے ہیں۔ اگر عربی میں پوری مہارت نہ ہوتی تو ان کے استعمال میں ضرور غلطی ہو جاتی۔ مثلاً:-

ع۔ جوہر میں انا سیف بیدِ اللہ لکھا تھا

ع۔ حُر پکارا بِأَبِی انت وَ اُمّی یا شاہ

ع۔ اے خداوند جہاں خُذ بیدی خُذ بیدی

ع۔ صلّوا علی النبی کی بیاباں میں دھوم ہے

ع۔ اشک آنکھوں سے برسا کے کہا یرحمہ اللہ

ع۔ کہتی تھی یہ گیتی کہ انا الطور انا الطور

ع۔ کیا خوب لڑے سَلّمک اللہ برادر

ع۔ اَلعَظمۃُ لِلّٰہ کی صدا برق سے نکلی

ع۔ اے مددگار و مُعینَ الضُعفا ادرکنی

ع۔ ہنس کر طوبیٰ لکمُ علی کہتے تھے

ع۔ عبرت کی ہے جا فاعتبروا یا اولی الابصار

ع۔ سمعاً و طاعۃً نہیں طاقت کہ دوں جواب

ع۔ عباس چلے کہہ کے توکلتُ علی اللہ

ع۔ چلّائیو نہ اینَ اَبی کہہ کے بار بار

ع - خالق کی یاد میں رہ و علن چاہیے تھیں

ع - العظمۃ للّٰہ تقدس و تعالیٰ

ع - مصباح دیں سراج مبیں ھادی الھدیٰ

ع - ھل من مبارز کی جو اعدا میں تھی پکار

ع - نکلے ہر صف سے جوانان قوی الہیکل

ع - ہونے لگا سوار جو وہ مالک الرقاب

ع - یا غافر المعاصی و یا واہب العطا

ع - اکبر جو مقابل ہوئے اس ضال و مضل کے

ع - ہے بے نیاز دھن و عصا دل سے شمع طور

ع - اس عجز و اعتلا پہ زباں بھی رکی ہوئی

ع - کس کو نہیں معلوم ترجیح مقرنس

ع - قدموں پہ آنکھیں مل کے کہا روحنا فداک

ع روحی فداک اے قمر برج ھل اتیٰ

ع قلبی لک الفدا اے گہر تاج لافتا

اوپر کی مثالوں میں جو لفظ، فقرے اور جملے خط نسخ میں لکھے ہوئے ہیں اُن سے انیسؔ کی عربی دانی ظاہر ہوتی ہے۔

(ب) عربی صرف و نحو اور معنی و بیان کے مسائل ان کو مستحضر تھے۔ انھوں نے اپنے کلام میں جا بجا ان کی طرف اشارے کیے ہیں۔ صرف و نحو کی کتابوں کے نام بھی ان کے کلام میں موجود ہیں۔ مثلاً:

ع - جملے ہیں وہی صاف وہی شرط و جزا ہے

ع - مصدر ہے جو مشتق ہے تو اعلیٰ سے علی ہے

ع - فقرے ہیں مبتدا کے خبر کی خبر نہیں

ع - وہ سینہ جس کو مصحف اکبر مشبہ بہ

ع - لو کو فیو! گرادیا حرف ثقیل کو

حرف ثقیل کا گرنا عربی قواعد کا ایک مسئلہ ہے "کوفیو" کا لفظ لاکر شاعر نے عربی نحویوں

کی دو جماعتوں کی طرف اشارہ کیا ہے جو 'کوفی' اور 'بصری' کہلاتی ہیں۔

ع - بنتی نہیں نفی کفر کی خاطر 'بلا' کبھی

عربی میں حروف نفی کئی ہیں۔ اُن میں سے ایک 'لا' بھی ہے۔ جب نفی کے لیے یہ حرف لاتے ہیں تو اس کو 'نفی بلا' کہتے ہیں۔

ع - وہ نور کی مصباح ہے یہ صاحب ضو ہیں

ظاہر ہے کہ اس مصرع میں 'مصباح' سے چراغ اور 'ضو' سے روشنی مراد ہے۔ مگر مصباح عربی نحو کی ایک کتاب ہے جس کو ناصر نحوی (متوفی ۶۱۰ھ) نے تصنیف کیا اور 'ضو' مصباح کی شرح مفتاح کا خلاصہ ہے' جو خود مفتاح کے مصنف تاج الدین اسفرائنی نے تیار کیا۔ (کشف الظنون جلد دوم مطبوعہ قسطنطنیہ ۱۳۱۱ھ صفحہ ۴۴۸ و ۴۴۹) ان دونوں کتابوں میں جو قریبی تعلق ہے۔ شاعر اس سے ضرور واقف ہے اور 'مصباح' اور 'ضو' کے لفظ قریب قریب لاکر ایک طرح کا ایہام پیدا کرنا چاہتا ہے۔ اس ایہام میں لفظ 'صاحب' سے بھی کام لیا گیا ہے کیونکہ 'صاحب ضو' کے معنی مصنف ضو بھی ہو سکتے ہیں۔

(ج) عربی اقوال و امثال کا ترجمہ بھی انیس کے کلام میں ملتا ہے مثلاً:-

ع - جا، ماں تری ماتم میں ترے سوگ نشیں ہو

یہ مصرع ترجمہ ہے اس بددعا کا "ثَکِلَتْكَ اُمُّكَ"

ع - بیٹا وہ ہے قدم بہ قدم ہو جو باپ کے

اشارہ ہے اس قول کی طرف "اَلْوَلَدُ سِرٌّ لِاَبِیْہِ"

(د) شعرائے عرب کا جا بجا ذکر کیا ہے۔ مثلاً؎

کیوں کر بیاں ہو شوکتِ شانِ پیمبری
عاجز ہیں یاں فرزدق و حسّان و حمیری

فرزدق، حسّان اور حمیری تینوں عرب کے نامور شاعر اور رسول یا آلِ رسول کے مدّاح تھے۔

(ہ) میر انیس کی عربی دانی کا ایک خاص ثبوت یہ ہے کہ ان کے کلام میں کہیں کہیں عربی کا انداز بیان موجود ہے مثلاً:-

ع ۔ فرزند ہوں میں مشعر و رکن و مقام کا
ع ۔ دل بند مکہ و عرفات و منا ہوں میں
ع ۔ احساں کا یہ عوض ہے کہ احسان کیجیے

میں کیا ہوں مری طبع ہے کیا اے شہ شاہاں
حسان و فرزدق ہیں یہاں عاجز و حیراں
شرمندہ زمانے سے گئے وائل و سحباں
قاصر ہیں سخن فہم و سخن سنج و سخن داں

۲۔ میر انیس قرآن و حدیث کا کافی علم رکھتے تھے۔ آیات و احادیث، اُن کے ترجمے، ان کی طرف اشارے، تفسیر و حدیث کی کتابوں کے نام، راویوں کے حوالے، یہ سب چیزیں ان کے کلام میں موجود ہیں جیسا کہ ذیل کی مثالوں سے ظاہر ہوگا:

ع ۔ کس کو اکملت لکم دینکم ارشاد کیا
ع ۔ شرح جعل الشمس ضیاءً تھی ہویدا
ع ۔ وہ خوں سے بھرے فاعتبروا یا اولی الابصار
ع ۔ اے قوم اذا زلزلت الارض یہی ہے

پوری آیت یہ ہے "اِذَا زُلْزِلَتِ الْاَرْضُ زِلْزَالَهَا"

ع ۔ آثار اذا زلزلت الارض عیاں ہوں
ع ۔ غضب اللہ علیہم کے عیاں تھے آثار
ع ۔ لب پر فسیکفیکہم اللہ کی آیت
ع ۔ محبوب کبریا کی صدا ہے کہ لا تخف

اشارہ ہے اس آیت کی طرف "لَا تَخَفْ وَلَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا"

ع ۔ یٰسین میں کہا ہے امام مبیں کسے

اشارہ ہے اس آیت کی طرف "کُلَّ شَیْءٍ اَحْصَیْنٰهُ فِیْ اِمَامٍ مُّبِیْنٍ"

ع ۔ نص مباہلہ ہے کہو کس کی شان میں

آیہ مباہلہ یہ ہے "قُلْ تَعَالَوْا نَدْعُ اَبْنَآءَنَا وَاَبْنَآءَكُمْ وَنِسَآءَنَا وَنِسَآءَكُمْ وَاَنْفُسَنَا وَاَنْفُسَكُمْ"

ع ۔ ہے اَنْفُسَنَا اَنْفُسَكُمْ کس سے اشارہ

اس مصرعے میں آیۂ مباہلہ کی طرف اشارہ ہے۔

ع ۔ آؤ کہ تم پہ پھونک دیں پڑھ کر وَاِن یَکاد

پوری آیت یہ ہے "فَاِنْ یَکَادُ الَّذِینَ کَفَرُوا الَّیُزلِقُونَکَ بِاَبصَارِھِم"

ع ۔ تھا خوف بخوم انکدرت چرخ بریں کو

پوری آیت یہ ہے "وَاِذَا النُّجُومُ انکَدَرَتْ"

ع ۔ کس کی ثنا ہے سورہ والعادیات میں

ع ۔ ہے کون مراد آیۂ لا اسئلکم سے

اشارہ ہے اس آیت کی طرف "قُل لَّا اَسئَلُکُم عَلَیہِ اَجرًا اِلَّا المَوَدَّۃَ فِی القُربیٰ"

ے کس کے لیے اَکمَلتُ لَکُم دینکم آیا

اَتمَمتُ عَلَیکُم کا ملا ہے کسے پایا

پوری آیت یہ ہے "اَکمَلتُ لَکُم دِینَکُم وَاَتمَمتُ عَلَیکُم نِعمَتِی"

ے شمس الضحیٰ اسی رخ نیکو کا وصف ہے

وَاللَّیلِ اِذَا سَجٰی اسی گیسو کا وصف ہے

ع ۔ جو رطب و یابس اس میں ہے سب ان کو یاد ہے

اشارہ ہے اس آیت کی طرف "لَا رَطبٍ وَّلَا یَابِسٍ اِلَّا فِی کِتَابٍ مُّبِینٍ"

ع ۔ اوتاد و آراضی عرب ہل گئے یک بار

ع ۔ قوسین کا ہے فرق جہاں رتبۂ ادنیٰ

اس آیت کی طرف اشارہ ہے: "فَکَانَ قَابَ قَوسَینِ اَو اَدنیٰ"

ے الفت کو، محبت کو، مودت کو کبھی بھولے

سب ایک طرف اجر رسالت کو کبھی بھولے

اس آیت کی طرف اشارہ ہے "قُل لَّا اَسئَلُکُم عَلَیہِ اَجرًا اِلَّا المَوَدَّۃَ فِی القُربیٰ"

ے اقرب ہے رگ جاں سے اور اس پر یہ بُعد

اللہ اللہ کس قدر دور ہے تو

پہلے مصرع میں اس آیت کی طرف اشارہ ہے "نَحنُ اَقرَبُ اِلَیکُم مِن حَبلِ الوَرِید"

اب کچھ مثالیں ایسی پیش کی جاتی ہیں جن میں کسی حدیث کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

ع ۔ شمشیر شرع عارف اسرار مَن عَرَف

ع ۔ فرزند صاحب شرفِ مَن عَرَف ہوں میں

اوپر کی دونوں مثالوں میں حضرت علی کے اس قول کی طرف اشارہ ہے "مَن عَرَفَ نَفسَہٗ فَقَد عَرَفَ رَبَّہٗ"

ع اصحاب خاص گرد تھے انجم کی طرح سب

رسولؐ کا قول ہے "اَصحَابِی کَالنُّجُومِ"

ہ کریم مجھ کو عطا کر وہ فقر دنیا میں
کہ جس کو فخر رسالت مآب سمجھے ہیں

رسولؐ کی اس حدیث کی طرف اشارہ ہے "اَلفَقرُ فَخرِی"

ع ۔ افضل ہے دو عالم کی عبادت سے یہ اک وار

رسولؐ کی حدیث ہے "ضَربَۃُ عَلِیٍّ یَومَ الخَندَقِ اَفضَلُ مِن عِبَادَۃِ الثَّقَلَینِ اِلیٰ یَومِ القِیَامَۃِ"

ع ۔ اس پر حدیث نَفسُکَ نَفسِی گواہ ہے

انیس نے اپنے بعض اشعار میں آیات قرآنی و احادیث نبوی کا ترجمہ بھی کیا ہے لیکن ظاہر ہے کہ نظم میں لفظی ترجمہ تقریباً محال اور اصل عبارت میں جزوی تغیر ناگزیر ہے اس لیے ذیل کی مثالوں میں بھی ترجمے سے لفظ بہ لفظ ترجمہ مراد نہیں ہے۔

تم پاس ہوں میں چھوڑتا دو امر عظیم اب
قرآن ہے اور عترت اطہار مری سب
ناجی ہے وہ ان دونوں سے جو رکھے گا مطلب
جو ہوگا خلاف ان سے نہ بخشے گا اسے رب
ان میں سے ہر اک مصحف ایماں کا ورق ہے
تابع رہو ان کے یہ رضامندی حق ہے

واللہ اگر میری رضامندی ہے درکار
تم ان سے خصومت نہ کبھی کیجو خبردار
آزار مجھے دو گے جو دو گے انھیں آزار
دونوں یہ جدا مجھ سے نہیں ہوئیں گے زنہار
میں ساتھ تمھارے ہوں جو ساتھ ان کے رہو گے
مجھ سے اسی تقریب سے کوثر پہ ملو گے

ان دونوں بندوں میں پہلے بند کے ابتدائی تین مصرعے اور دوسرے بند کے

آخری تین مصرعے اس حدیث کا ترجمہ ہیں۔ "اِنّی تَارِکٌ فِیکُمُ الثَّقَلَین کِتَابَ اللّٰہِ وَعِترَتِی اَھلَ بَیتِی مَا اِن تَمَسَّکتُم بِھِمَا لَن تَضِلُّوا بَعدِی وَاِنَّھُمَا لَن یَفتَرِقَا حَتّٰی یَرِدَا عَلَیَّ الحَوضَ"

دوسرے بند کے تیسرے مصرعے میں رسولؐ کی اس حدیث کی طرف اشارہ ہے:
"فَاطِمَۃُ بِضعَۃٌ مِنّی مَن اٰذَاھَا فَقَد اٰذَانِی"

جو دوست ہے اس کا وہ مرادوست ہو، دشمن ہے جو اس کا مرادشمن ہے وہ گمراہ
رسول کے اس قول کا ترجمہ ہے "مَن اَحَبَّ عَلِیًّا فَقَد اَحَبَّنِی وَمَن اَبغَضَ عَلِیًّا فَقَد اَبغَضَنِی"

ہ شہ نے سُنا عرب سے جو سارا یہ ماجرا
فرمایا بازگشت ہے سب کی سوئے خدا

"بازگشت ہے سب کی سوئے خدا" ترجمہ ہے "اِنَّا اِلَیہِ رَاجِعُون" کا۔ اور اشارہ ہے اس آیت کی طرف "اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیہِ رَاجِعُون"

ع - تیغ ایسی نہ ہوگی نہ جوان ہوئے گا ایسا
"لَا فَتٰی اِلَّا عَلِی لَا سَیفَ اِلَّا ذُوالفِقَار" کا ترجمہ ہے۔

تفسیر اور حدیث کی کتابوں کے نام نیچے لکھے ہوئے اشعار میں ملتے ہیں:
ع - پڑھتے ہیں تہنیتِ فتح کو باری باری
فتح اور باری کے لفظ قریب قریب لاکر شاعر نے ذہن کو ابن حجر عسقلانی کی کتاب فتح الباری کی طرف بھی منتقل کر دیا ہے۔

ع - تفسیرِ حسینی ہے خطِ مصحفِ رخسار
تفسیرِ حسینی ملا حسین واعظ کاشفی کی تفسیر قرآن کا نام ہے۔

ہ کشاف امرِ حق ہے بیاں اس سعید کا
ہاں ترجمہ ہے مصحفِ ربِّ مجید کا

کشاف علامہ زمخشری کی تفسیر قرآن کا نام ہے۔ دوسرے مصرعے سے صاف ظاہر ہے کہ شاعر نے لفظ کشاف میں ایہام ملحوظ رکھا ہے۔

ع - لکھتا ہے مناقب میں یہ راوی دل آگاہ

مناقب ابن شہر آشوب کی ایک کتاب کا نام ہے۔
ان دو مصرعوں میں راویوں کے نام ملتے ہیں:
ع۔ سید بن طاؤس سے ہے ایک روایت
ع۔ ناقل ہے اس حدیث کا سلمانِ خوش سیر

۳۔ میرانیس اپنے زمانے کے علوم رسمی یعنی صرف و نحو، معنی و بیان، عروض، منطق، فلسفہ، تاریخ، طب، رمل وغیرہ سے واقف تھے۔ ان علوم کے مسائل اور اصطلاحیں ان کے کلام میں موجود ہیں۔ صرف و نحو اور معنی و بیان کے متعلق مثالیں اوپر گزر چکی ہیں۔ ذیل میں وہ مثالیں پیش کی جاتی ہیں۔ جن سے دوسرے علوم کی واقفیت ظاہر ہوتی ہے۔

عروض کی مثالیں

کامل تھی زبس بحر شجاعت میں وہ تلوار ‏ مثل الفِ وصل گرے جاتے تھے کفار
جو کوئی قریب آیا رجز خواں دم پیکار ‏ سالم تھا تو بے فاصلہ رکن اسکے ہوئے چار
کیا لڑتے کہ سکتہ تھا ہر اک اہل حسد کو
تقطیع کیا تیغ نے ہر مصرع قد کو

اس بند میں کامل، بحر، رجز، سالم، فاصلہ، رکن، سکتہ، تقطیع، مصرع عروض کی اصطلاحیں ہیں بند کے دوسرے مصرعے میں ایک عروضی مسئلے کی طرف اشارہ ہے۔

تقطیع مصرع قد اعدا میں تھی وہ فرد ‏ اور نظم چار پارہ میں کامل پے نبرد
ناقص کیا انھیں جنھیں مولا کا تھا نہ درد ‏ تھے ضرب ثقیل سے اس کی خفیف مرد
بحر فنا زمیں پہ تو برق آسمان پر
سیفی کا سب عروض تھا اس کی زبان پر

اس بند میں تقطیع، مصرع، فرد، نظم چار پارہ، کامل، ناقص، ضرب ثقیل، خفیف، بحر، عروض کی اصطلاحیں ہیں۔ آخری مصرعے میں فن عروض کی کتاب عَروضِ سَیفی کا ذکر ہے۔

منطق و فلسفہ کی مثالیں

ع۔ اک فصل میں اس جنس کے عقدے کبھی کھلیں گے

ع - ہر فرد کو اس صاحب ہمت نے کیا زوج

ع - ہے شکل ممتنع قسم واجب الوجود

ع - ہے جو ہر فرد اس کی نہ ہوگی کبھی تقسیم

ع - تقسیم جز ولا یتجزیٰ محال ہے

ع - کرتی تھی شکل کو وہ ہیولیٰ سے منفصل

ع - ہر جزو تن کو لا یتجزیٰ بنا دیا

ع - عالم مرکبات میں تھا مفردات کا

اوپر کی مثالوں میں فصل، جنس، فرد، زوج، ممتنع، واجب الوجود، جوہر فرد، جزولا یتجزیٰ، شکل، ہیولیٰ، مرکبات، مفردات، منطق اور فلسفے کی اصطلاحیں ہیں۔

طب سے متعلق

ع - دودی جو ملی نبض تو آنسو نکل آئے

ع - سب زرد تھا ازمان حرارت سے تن زار

ع - جیسے تپ محرق میں جوان کو عرق آئے

ان مثالوں میں 'نبض دودی' 'ازمان حرارت' اور تپ محرق، طب کی اصطلاحیں ہیں، جن سے طبی واقفیت ظاہر ہوتی ہے۔

علم رمل سے واقفیت

سر کے ہوا بلند تو پھینکا زمین پر ۔۔۔ طفلی سے زائچے میں کھنچا تھا اجل کا گھر

پہچاننا بھی شکل کا اشکال ہو گیا

ایک ایک عضو قرعۂ رمال ہو گیا

اس بند میں زائچہ، گھر، شکل، قرعہ، رمل کی اصطلاحیں ہیں۔

تاریخ اسلام پر نظر

انیس تاریخ اسلام سے واقف تھے۔ ان کے کلام میں تاریخی واقعات کا ذکر، معرکوں اور غزوں کا حال کثرت سے ملتا ہے۔ واقعۂ کربلا کے تمام جزئیات تفصیلات سے بھی بخوبی واقف تھے۔ ان کے بیان سے مرثیے بھرے پڑے ہیں۔ انصار حسین کے نام، ان کے کارنامے، یزیدی لشکر کے لوگوں کے نام، ان کے عہدے

ان کے مظالم وغیرہ جا بجا تفصیل سے لکھے ہیں[1]۔ ذیل میں چند بند مثال کے طور پر نقل کیے جاتے ہیں، جن سے اس بیان کی تائید ہوتی ہے:-

کربلا میں امام حسین کا داخلہ اور فوجوں کی آمد

تاریخ دوسری تھی کہ داخل ہوئے امام
اور تیسری کی صبح کو آئی سیاہ شام
آنے کی شمر کے ہوئی چوتھی کو دھوم دھام
تھی پانچویں کہ دشت ستم بھر گیا تمام
نرغہ ہوا چھٹی سے ستمگر شریروں پر
ہفتم سے بند ہو گیا پانی حسین پر
تھا ہشتم و نہم کو تو اک شور العطش
تھے نہر علقمہ سے بہشتی کنارہ کش

حسینی لشکر

ایسی نہ فوج کچھ ہے نہ ایسے نشان ہیں
میں نے تو خود گنا ہے اکاسی جوان ہیں
اسوار بھی قلیل پیادے بھی تھوڑے ہیں
کل سترہ سوار ہیں اور بیس گھوڑے ہیں
ہم شکل مصطفےٰ کو تو اٹھارواں ہے سال
تیرہ برس کا ہے ابھی شبیر کا نونہال
نو دس برس کے ہوئیں گے زینب کے دونوں لال
ہاں اک جواں ہیں حضرت عباس خوشخصال
چھوٹے ہیں اور سب کوئی ان میں جواں نہیں
خط اک طرف مسیں بھی کسی کے عیاں نہیں
سنتا ہوں میں ہیں دو پسر شاہ نامدار
بیمار ان میں ایک ہے اور ایک شیرخوار
زینب کے دو ہیں تین حسن کے ہیں گلعذار
دس ہیں عقیل و مسلم و حیدر کے یادگار
زہرا کے جان و دل ہیں محمدؐ کے پیارے ہیں
کل سترہ تو چاند ہیں باقی ستارے ہیں

انصار حسین کے نام

بگڑے ابو ثمامہ و سعد فلک سریر
تو لی زہیر قین نے شمشیر بے نظیر
جوڑا کماں میں ابن مظاہر نے جھک کے تیر
بولے اسد کہ زجر کے قابل ہیں یہ شریر
عابس کو غیض لشکر بدخو پہ آ گیا
غصے سے بل ہلال کے ابرو پہ آ گیا

---

[1] انیس کے بعض بیانات تاریخی واقعات کے مطابق نہیں ہیں۔ ان کے لیے علاحدہ بحث درکار ہے۔

بولے اٹھا کے نیزے کو ضرغامۂ دلیر　　بس اب سزا میں ان کی مناسب نہیں ہے دیر
بولے شعیب ادھر سے جو نکلے گا ایک شیر　　بھاگیں گے سب یہ گھوڑوں کی باگوں کو پھیر پھیر

آقا کا ہے یہ پاس کہ ہم دور دور ہیں
کثرت پہ اپنی بھولے ہیں کیا بے شعور ہیں

پہلے محمد غازی نے صفیں کیں تہ و بالا　　پھر بھائی گیا رن میں ہلاتا ہوا بھالا
فرزند نے رہوار کو چمکا کے نکالا　　تینوں جو ہوئے قتل تو رو دیئے شہ والا

کہرام تھا مہماں کے لیے اہل حرم میں
رونے کو بتول آئی تھی میدانِ ستم میں

میدان میں مسلم پسرِ عوسجہ آیا　　تلوار جو کھینچی تو ہزاروں کو بھگایا
جس دم وہ گرا شہ نے بڑا رنج اٹھایا　　چھاتی سے کئی مرتبہ زخمی کو لگایا

لاشے کے گلے مل کے جدا ہوتے تھے شبیر
عورات میں غل ہوتا تھا جب روتے تھے شبیر

ضرغامہ و وہب و انس و مالک دیں دار　　حجاج و زہیر اسدی عامر و عمار
عمران و شعیب و عمرو شوذب ابرار　　قربان حسین ابن علی ہو گئے یک بار

جس سمت یہ جاں باز تھے خالی وہ پرا تھا
اور دور تلک دشتِ ستم خوں سے بھرا تھا

\ باقی جو رفیقِ شہ دیں رہ گئے دو چار　　حسرت سے انھیں دیکھتے تھے سیدِ ابرار
کی بڑھ کے حبیب ابن مظاہر نے یہ گفتار　　یہ پیر غلام اب ہے اجازت کا طلبگار

بندے کو بھی مرنے کی رضا دیجیے آقا
فردوس کے رستے پہ لگا دیجیے آقا

یزیدی فوج کی تعداد

اس فوج ستم موج کی تعداد ہے دشوار　　لکھتا ہے کوئی تیس ہزار آئے تھے غدار
اور اس سے فزوں تر بھی ہو کچھ دار و مدار　　اکثر کا یہ ہے قول کہ تھے لاکھ ستمگار

لکھتے ہیں یہ بعضے کہ چھ لاکھ اہل جفا تھے
یاں بیکس و مظلوم امامِ دوسرا تھے

فوج یزید کے سردار

یہ سنتے تھے جو دوسرا آکر یہ پکارا	آپہنچا یزید ابن رکاب ستم آرا
عمان شقاوت نے ہے اک زور سا مارا	گھوڑوں سے رکا جاتا ہے دریا کا کنارا

پانی بھی کوئی نہر سے پاتا نہیں اب تو
جز تیغ و سناں کچھ نظر آتا نہیں اب تو

آئے دہل فتح بجاتے ہوئے باہم	حجاج و سنان ابن انس، خولی و قشعم
تھے چار ہزار اہل ستم اور بھی ظالم	انبوہ ہوا تا ششم ماہِ محرم

اُمڈی ہوئی بادل کی طرح فوج گراں تھی
مقتل کی زمیں گھوڑوں کی ٹاپوں سے نہاں تھی

۴۔ میر انیس کو فارسی زبان و ادب پر بڑا عبور تھا۔ اس کے لیے کسی ثبوت کی ضرورت نہیں۔ ان مرثیوں کو پڑھیے تو ایک ایک مصرع ان کی فارسی دانی پر شہادت دیتا چلا جاتا ہے۔ فارسی الفاظ کا برمحل صرف، دلاویز ترکیبیں، شعرائے فارسی کا انداز بیان، فارسی کے اقوال و امثال کی طرف اشارے، فارسی اشعار کے ترجمے، جا بہ جا فارسی اشعار کو تضمین کرنا۔ یہ سب ان کے فارسی پر مہارت تام رکھنے کے بین ثبوت ہیں۔

میر انیس فارسی نظم و نثر لکھنے پر بھی قادر تھے۔ فاضل اجل جناب علامہ مفتی میر عباس صاحب قبلہ مغفور کی مثنوی من و سلویٰ کی تاریخ طبع فارسی میں کہی تھی جو ذیل میں درج کی جاتی ہے:

طبع شد ایں نظم از فضل الٰہ	در جلوسِ میمنت مانوس شاہ
خاصۂ درگاہ ربّ ذوالمنن	ظلِ حق واجد علی شاہِ زمن
حسبِ حکم سید معجز بیاں	قبلۂ کونین استادِ زماں
فاضل باذل، فقیہ بالیقیں	آفتاب آسمان علم و دیں
چوں تامل کرد با فکر سلیس	از پے تاریخ آں طبع انیس
داد ہاتف ایں صدائے دلپذیر	ہست تاریخش کلام بے نظیر
	۱۲۶۳ھ

اس نظم کا تیسرا شعر بتاتا ہو کہ یہ تاریخ مصنف علام کی فرمائش سے لکھی گئی تھی۔ جناب مفتی صاحب قبلہ نے خود بھی لکھ دیا ہو کہ میر انیس نے یہ تاریخ ان کی فرمائش سے عجلت میں لکھی۔ فرماتے ہیں:

بازتاریخ دگر کردم طلب | از جناب سیدِ والا نسب
نورِ شمع مجلس صدق و صفا | ذاکرِ مقبول سبطِ مصطفا
بلبلِ دستاں زنِ بستانِ ہند | مادحِ میرِ عرب سحبانِ ہند
شاعرِ یکتا، رئیسِ ذاکرین | تارکِ دنیا انیسِ اہلِ دین
ازتجالاً آں وحیدِ روزگار | زد رقم ایں چند بیت آبدار

اسی مثنوی من وسلوی کو پڑھنے کے بعد میر انیس نے جناب مفتی صاحب قبلہ کو ایک خط لکھا تھا جو نقل کیا جاتا ہے:-

"قبلہ و کعبۂ خلوص کیشاں دام ظلکم العالی
زبان ایں کج مج بیان را چہ یارا کہ مدح ایں اشعارِ آبدار نماید۔ الحق کہ دارین جز و زمان طرز اعجاز طرازی و سحر پردازی بر ذات فیض آیات ختم گردیدہ ؎
مو قلم بودہ است گوئی کلک معجز سلکِ تو | صفحۂ قرطاس را کردی نگارستان چیں
از علیِ الکمال نگاہ داشتہ سایہ ہا پایہ را بر مفارق خادمان خاص مبسوط دارا د بحق محمد و آلہ الامجاد[1] "

گو کہ یہ مضمون کافی محنت اور تجسّس کا نتیجہ ہے تاہم ابھی اس موضوع پر لکھنے کی بہت گنجائش ہے۔ میں نے صرف ایک راستہ نکال دیا ہے کہ اگر وہ لوگ جو قرآن، حدیث، ادب عربی، علوم اسلامیہ وغیرہ میں وسیع نظر رکھتے ہیں اس راستے پر چلیں گے تو معلوم ہوگا کہ انیسؔ نے کہاں کہاں ان کی طرف اشارہ کیا ہے، کہاں کہاں آیات و احادیث اور اقوال و امثال و اشعارِ عرب کا ترجمہ کیا ہے اور کہاں کہاں مسائلِ علمی سے کام لیا ہے۔ ان سب کی تحقیق کے بعد انیسؔ کا علمی پایہ صحیح طور پر معین کیا جا سکے گا۔

بہر حال جو کچھ اوپر لکھا گیا ہے اور جو مثالیں پیش کی گئی ہیں اُن سے بھی بصاف ظاہر ہے کہ انیسؔ عربی بخوبی جانتے تھے اور ان کو مختلف علوم یا کم سے کم ان کی اصطلاحوں کا کافی علم تھا اور وہ ایک من علم سے کام لینے کے لیے دس من عقل بھی رکھتے تھے۔ کتابیں پڑھ پڑھ کر "چارپائے بر او کتابے چند" کا مصداق بن جانا اور چیز ہے اور۔

---

[1] سوانح عمری مفتی میر محمد عباس موسوم بہ تجلیات صفحہ ۱۸۹۔

اپنے مبلغ علم کو جزو ذات بنا لینا اور اُس پر حاکمانہ قدرت رکھنا اور چیز ہے۔

اس بحث کے خاتمے میں ایک بار یہ بات جو ابتدا میں کہہ چکا ہوں پھر یاد دلاتا ہوں کہ عربیت کا غلبہ اور علمیت کا اظہار جتنا انیس کے ابتدائی مرثیوں میں ہے اتنا آخری مرثیوں میں نہیں ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جو جو مشق سخن بڑھتی گئی وہ وہ یہ قدرت بھی بڑھتی گئی کہ باریک اور نازک خیالوں کو عربی لفظوں اور علمی اصطلاحوں سے بچ کر سادہ اور عام فہم زبان میں ادا کریں۔ اس موقع پر مجھے ایک تاریخی حکایت اور ایک زبردست ادیب کی ہدایت یاد آگئی۔ بابر بادشاہ نے جس کا قلم اس کی تلوار سے کم نہ چلتا تھا اور جس کی خود نوشتہ سوانح عمری نے اس کو دنیا کے ممتاز ادیبوں میں جگہ دی ہے، ایک مرتبہ اپنے بیٹے ہمایوں کو جو اس کے بعد تخت و تاج کا مالک ہوا، لکھا کہ "تم خط اچھا نہیں لکھتے ہو، تمھاری تحریر میں سب سے بڑا نقص یہ ہوتا ہے کہ تم اس میں اپنی قابلیت کی نمائش کرنے لگتے ہو"۔ بابر کی یہ نصیحت تمام انشا پردازوں اور شاعروں کے لیے شمع ہدایت ہے۔

شاد عظیم آبادی کی غزل گوئی کی شہرت عام ہے۔ وہ مرثیے بھی کہتے تھے اور مرثیہ گوئی میں مرزا دبیر کے شاگرد اور میر انیس کے پیرو تھے۔ ان کا ایک مضمون "تصحیح الفاظ و متروکات" کے عنوان سے رسالہ "اردوئے معلیٰ" علی گڑھ کے اکتوبر ۱۹۰۳ء کے پرچے میں شائع ہوا تھا۔ اس میں وہ لکھتے ہیں:-

"میر انیس مرحوم سے جہاں تک راقم آثم کو صحبت نصیب ہوئی اور جہاں تک جید استعداد والے بزرگوں نے ان کو جانچا، درسیات میں ان کی غضب کی یادداشت تھی۔ حکیم مولوی میر امیر جان مغفور اس زمانے میں صدرا پڑھتے تھے۔ کسی مشکل سبق کے سبب سے میر صاحب کی ایک مجلس میں شریک نہ ہو سکے۔ جب ملاقات ہوئی تو میر صاحب نے سبب عدم شرکت پوچھا۔ حکیم صاحب نے کہا کہ قبلہ کیا عرض کروں، صدرا کے شناۃ بالکریر کے ایر پھیر میں پڑا ہوں۔ اب تک حل نہیں ہوا۔ میر انیس مرحوم نے صدرا کے اس مقام کی پوری عبارت پڑھی اور فرمایا کہ کہیے کس بات میں شک ہے۔ انھوں نے اپنا شک بیان کیا تو میر صاحب نے فرمایا کہ ... آپ کو فلاں ضمیر دھوکا دے رہی ہے اس ضمیر کو

فلاں لفظ کی طرف رجوع کیجیے تو مطلب صاف ہوجائے گا۔ حکیم صاحب نے جب ایسا کیا تو فوراً مطلب ذہن نشین ہو گیا۔ پھڑک گئے اور حیرت سے کہا کہ قبلہ آپ کو درسیات میں بھی ایسی دستگاہ ہے۔ میرا مقصود اس نقل سے یہ ہے کہ جیسا بعض ناواقفوں کو میر انیس کے بارے میں کم استعدادی کا گمان ہے، بالکل بے اصل اور محض غلط ہے۔ راقم آثم کی چشم دید اور بہت سی ایسی نقلیں ہیں جن کو سن کر معلوم ہو جائے گا کہ میر صاحب کی علمی لیاقت کتنی تھی۔"

"مجھ کو یاد ہے کہ جب میر صاحب نے اپنی یہ بیت پڑھی ؎

آپس میں دوستوں کو تکلف نہ چاہیے　　ہاں مال غیر کف میں تصرف نہ چاہیے"

تو خود فرمایا کہ ماخذ اس کا "کفو" ہے مگر فصحائے اردو زبان "کف" بولا کرتے ہیں"

[اس سے معلوم ہوتا ہے کہ میر انیس فصحا کے تلفظ کو لغت پر ترجیح دیتے تھے۔]

اسی مضمون میں شاد نے لکھا ہے کہ:

"فردوسی کی فطری فصاحت نے ایسے لفظ اور ترکیبیں استعمال کیں کہ شاہنامے کی زبان آج نو سو برس کے بعد بھی ویسی ہی پسندیدہ ہے جیسی اس کے زمانے میں تھی۔"

میر انیس کی زبان کے بارے میں فرماتے ہیں کہ

"اردو زبان میں میر انیس مرحوم کی فطری فصاحت نے بھی وہی کیا ہے جو فارسی میں فردوسی نے کیا۔ ان کے دل چسپ الفاظ اور موثر ترکیبیں بھی مدتوں تک زبان سے کبھی نہ بھولیں گی۔"

میر انیسؔ کی سیرت

میر انیسؔ ایک خوش مزاج آدمی تھے۔ لیکن خوش مزاجی کے ساتھ نازک مزاجی بھی تھی جو ذرا سی بدتہذیبی کو برداشت نہیں کر سکتی تھی۔ اس نازک مزاجی کی وجہ خود بینی و خود پسندی نہ تھی۔ بات یہ تھی کہ وہ نہایت مہذب تھے، دوسروں کے حفظ مراتب اور تالیفِ قلب کا حد درجہ خیال رکھتے تھے۔ ایسی طبیعتیں جو دوسروں کے ساتھ کسی طرح کی بدتہذیبی روا نہیں رکھ سکتیں ظاہر ہے کہ وہ خود اپنے ساتھ کب جائز رکھ سکیں گی۔ ان کی نازک مزاجی اس وقت اور بڑھ جاتی تھی جب وہ منبر پر بیٹھے ہوئے اپنا کلام پڑھ رہے ہوں، اس وقت ان پر ایک محویت کا عالم طاری ہوتا تھا اور وہ اپنے کمال کے نشے میں سرشار ہو کر اس بلندی پر پہنچ جاتے تھے جہاں سے بے کمالی کا درجہ، خواہ وہ ریاست و امارت ہی کا لباس کیوں نہ پہنے ہو، بہت پست معلوم ہونے لگتا ہے۔ بہت سی مشہور روایتیں میر صاحب کے اس اندازِ طبیعت کی تصدیق کرتی ہیں۔

خودداری اور عزتِ نفس میر انیسؔ کی سیرت کے بہت نمایاں خصوصیات تھے۔ اور وہ انسانیت کے ان بے بہا جوہروں کو کسی قیمت پر بیچنے کو تیار نہ تھے بلکہ ان کی موجودگی میں مصیبتوں اور تکلیفوں کو ہیچ سمجھتے تھے۔ فرماتے ہیں ؎

بھگو کے کھاتے ہیں پانی میں نانِ خشک کو ہم ۔۔۔ اس آبرو کو جو موتی کی آب سمجھے ہیں

خدا بات رکھے جہاں میں انیسؔ ۔۔۔ یہ دن ہر طرح سے گزر جائیں گے

لیکن خودداری حدِ اعتدال سے گزر کر خود بینی تک پہنچ گئی تھی۔ ان کی طبیعت کا فطری میلان انکسار کی طرف تھا اور وہ خاکساری کو انسان کی ایک قابلِ فخر صفت سمجھتے تھے۔ خود

---

[1] مطبوعہ ماہنامہ ادب لکھنؤ جنوری ۱۹۳۰ء و ماہ نو کراچی انیس نمبر اضافی شمارہ ۱۹۷۲ء

فرماتے ہیں ؎

گردوں کو اگر ہے سرکشی کا غرّہ — مجھ کو بھی غرورِ خاکساری کا ہے

جھک کے دشمن سے بھی ملتا ہے نیسؔ — نہ کسے جو یہ وہ تلوار نہیں

کبھی بُرا نہیں جانا کسی کو اپنے سوا — ہر ایک ذرّے کو ہم آفتاب سمجھے ہیں

دی ہے جو خدا نے سرفرازی مجھ کو — ثمرہ یہ نہال خاکساری کا ہے

مگر انکسار میں بھی اعتدال تھا۔ مغروروں اور بدمغزوں سے انکسار کرنا انکسار کی توہین کرنا ہے۔ میر صاحب اپنے طرزِ عمل میں اس نکتے پر نظر رکھتے تھے۔ فرماتے ہیں ؎

ہر کس و ناکس سے جھکنے کا نہیں

ہم دموا میں تیغ جوہر دار ہوں

میر صاحب نے جہاں انکسار کی تعریف کی ہے وہاں غرور کی مذمت بھی نہایت موثر پیرایوں میں کی ہے۔ فرماتے ہیں ؎

دیکھنا کل ٹھوکریں کھاتے پھریں گے ان کے سر — آج نخوت سے زمیں پر جو قدم رکھتے نہیں

ملا جنھیں انھیں افتادگی سے اوج ملا — انھیں نے کھائی ہے ٹھوکر جو سر اٹھا کے چلے

زمیں کے تلے جن کو جانا ہے اک دن — وہ کیوں سر کو تا آسماں کھینچتے ہیں

مانا ہم نے کہ عیب سے پاک ہے تو — مغرور نہ ہو جو اہلِ ادراک ہے تو

بالفرض گر آسمان ہے تیرا مقام — انجام کو سوچ لے کہ پھر خاک ہے تو

عزّتِ نفس اور قناعت کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ قناعت نہ ہو تو عزّتِ نفس کا خیال نبھ نہیں سکتا۔ میر انیسؔ صحیح معنوں میں قانع اور متوکل آدمی تھے۔ اپنے اور اپنے اہل و عیال کے لیے کسبِ معاش تو واجب تھا، لیکن حرص و ہوس میں گرفتار نہ تھے۔ اور اگر اپنے فطری خاصّے کی بنا پر حرص کبھی گلو گیر ہوئی تو اس سے پیچھا چھڑانے کی کوشش کرتے تھے، جیسا کہ اس شعر سے ظاہر ہے ؎

گریباں مرا چھوڑ اے حرصِ دنیا

مرے ہاتھ میں دامنِ پنجتن ہے

قرآنی تعلیم کے مطابق ان کا اعتقاد تھا کہ خدا تمام مخلوقات کے رزق کا ضامن ہے۔ اس لیے اطمینان سے زندگی بسر کرتے تھے اور دولت کی طلب میں زیادہ دوادوش

نہیں کرتے تھے۔ فرماتے ہیں ؎

کنج عزلت میں مثال آسیا ہوں گوشہ گیر — رزق پہنچاتا ہے گھر بیٹھے خدا میرے لیے

ہمیں تو دیتا ہے رازق بغیر منت خلق — وہی سوال کریں جو خدا نہیں رکھتے

ہر صبح کو دوڑ کر کدھر جاتا ہے — کچھ گوہر عزت کا بھی دھیان آتا ہے

گر ضامن روزی ہے خداوند کریم — پھر کس لیے تو رزق کا غم کھاتا ہے

کسی کے آگے ہاتھ پھیلانا اور حسن طلب کے حیلے نکالنا انھیں پسند نہیں تھا کہتے ہیں ؎

طلب سے عار ہے اللہ کے فقیروں کو — کبھی جو ہو گیا پھیرا صدا سنا کے چلے

نہ پھیلائیو ہاتھ ہرگز انیس — فقیری میں بھی دل تونگر رہے

کیا قبول قناعت سے بحر عالم میں — صدف کی طرح میسر جو آب و دانہ ہوا

جو مقرر ہے وہ ملتا ہے تری سرکار سے — ہم ہیں صابر، کچھ خیال بیش و کم رکھتے نہیں

کسی انسان کا کیا ذکر خدا سے مانگنے میں بھی خود داری کا پہلو جانے نہیں دیتے تھے۔ کہتے ہیں ؎

کریم جو تجھے دینا ہے بے طلب دے دے
فقیر ہوں یہ نہیں عادت سوال مجھے

خدا نے ان کو جو جو نعمتیں عطا کی تھیں ان پر وہ اس کا شکر ادا کرتے تھے اور اس طرح جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ان عطیوں کو بھی اپنے استحقاق سے زیادہ سمجھتے تھے۔ پست نظر صرف دولت کو نعمت سمجھتے ہیں مگر انیس کی نگاہ بلند تھی۔ وہ جانتے تھے کہ دولت سے کہیں بڑی بڑی نعمتیں ہیں جن کے لیے منعم کا شکر واجب ہے۔ فرماتے ہیں ؎

عقل و ہنر و تمیز جان و ایماں — اس ایک کف خاک کو کیا کیا بخشا

آبرو و مال و فرزندانِ صالح، عز و جاہ — کس کی خاطر یہ ہوا جو کچھ ہوا میرے لیے

بھر دیا دامن کو مولا نے دُرِ مقصود سے — زر دیا زر پر، عطا پر کی عطا میرے لیے

توقیر ترے ہی آستانے سے ملی — عزت ترے در پہ سر جھکانے سے ملی

مال و زر و آبرو و دین و ایماں — کیا کیا دولت ترے خزانے سے ملی

کرتا ہے جو مجھ سے زرد رو کو سرسبز — اے ابر کرم یہ سب کرم تیرا ہے

خدا کی دی ہوئی ان نعمتوں کے احساس سے ان کا دل ہر حالت میں غنی رہتا تھا۔ بلکہ

وہ اپنے کو بڑے سے بڑے دولت مند سے زیادہ سرمایہ دار سمجھتے تھے۔ فرماتے ہیں ؎

قناعت و گہر آبرو و دولت دیں — ہم اپنے کیسۂ خالی میں کیا نہیں رکھتے
ایک کشکولِ توکل، ایک نقدِ جاں ہے پاس — ہیں غنی دل کے کوئی دام و درم رکھتے نہیں

توکل اور قناعت کی انتہا یہ تھی کہ میر صاحب کی نظر میں تونگری سے زیادہ فقیری کی عظمت تھی۔ کہتے ہیں ؎

فقر کی دولت کو کیا خالق نے بخشا ہے وقار
ہاتھ پھیلاتا ہے سلطاں بھی گدا کے سامنے

وہ خدا سے دولت فقر کے طالب بھی تھے، مگر فقر سے ان کی مراد گداگری نہ تھی بلکہ مالِ دنیا سے استغنا۔ فرماتے ہیں ؎

کریم مجھ کو عطا کر وہ فقر دنیا میں
کہ جس کو فخرِ رسالت مآب سمجھے ہیں

ان کی یہ دعا قبول ہوئی اور انھیں اس دولت کے ملنے پر بڑا فخر تھا۔ کہتے ہیں ؎

بخشی ہے خدا نے ہم کو وہ دولتِ فقر
برسوں ڈھونڈے تو بادشا کو نہ ملے

میر صاحب نشۂ فقر میں سرشار ہو کر کبھی کبھی بالاعلان بندگانِ زر سے بیزاری کا اظہار کر دیتے تھے اور اس حالت میں ان کی بلند نظری اہلِ دولت کی شان کو بہت پست سمجھنے لگتی تھی، یہاں تک کہ ان کی ہتک کی بھی انھیں پروا نہ ہوتی تھی، جیسا کہ ذیل کے شعروں سے ظاہر ہے ؎

فقیر دوست جو ہو ہم کو سرفراز کرے — کچھ اور فرش بہ جز بوریا نہیں رکھتے
فقیروں کی مجلس ہے سب سے جدا — امیروں کا یاں تک گزارا نہیں
سکندر کی خاطر بھی ہے سدِّ باب — جو دارا بھی ہو تو مدارا نہیں
دولت کا ہمیں خیال آتا ہی نہیں — یہ نشۂ فقر ہے کہ جاتا ہی نہیں
لبریز ہیں یہ دولتِ استغنا سے — آنکھوں میں کوئی غنی سماتا ہی نہیں

اوپر لکھا جا چکا ہے کہ میر انیس حریص نہ تھے، مگر اس کے ساتھ ہی وہ فضول خرچ بھی نہ تھے۔ بلکہ ایک بزرگ کے چشم دید بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ ذرا ہاتھ روک کر

خرچ کرتے تھے۔ سخاوت کی تعریف جس میں اکثر حسن طلب بھی شامل ہوتا ہے، ان کے کلام میں کم ہے۔ دولت والوں کو ان کی تعلیم بھی یہ ہے کہ اگر تم سخاوت نہیں کر سکتے تو نہ سہی، مگر انسانیت کے برتاؤ میں تو کمی نہ کرو۔ اس میں تو کچھ خرچ نہیں ہوتا ۔

دہان کیسۂ زر بند رکھو اے منعم
خدا کے واسطے وا کر جبیں کی چینوں کو

میر انیس کثیر الاحباب تو نہ تھے مگر جس سے دوستی ہو جاتی تھی اسے نباہنے کی کوشش کرتے تھے۔ وہ رشتۂ محبت کی نزاکت سے خوب واقف تھے۔ فرماتے ہیں ؎

مجھے کس لیے قدرداں کھینچتے ہیں
محبت کا رشتہ نہایت ہے نازک

خیال خاطر احباب چاہیے ہر دم
انیسؔ ٹھیس نہ لگ جائے آبگینوں کو

دوستوں کی خاطر شکنی کا کیا ذکر وہ کسی کا بھی دل دکھانا پسند نہیں کرتے تھے۔ ذیل کے شعر میں انھوں نے دعویٰ بھی کیا ہے کہ ہم نے کبھی کسی ادنیٰ سے ادنیٰ مخلوق کو بھی تکلیف نہیں پہنچائی ؎

کسی کا دل نہ کیا ہم نے پائمال کبھی
چلے جو راہ تو چیونٹی کو بھی بچا کے چلے

مصیبت اور تکلیف اولاد آدم کو میراث میں ملی ہے۔ میر انیس کو بھی تکلیفوں سے سامنا کرنا پڑا مگر وہ بڑے صبر و ضبط کے آدمی تھے۔ مصیبت کی شکایت کرنا پسند نہ کرتے تھے اور اس کی ایک نئی اور نہایت معقول وجہ انھوں نے اس شعر میں بتائی ہے ؎

راحت خدا نے دی تو کیا تو نے شکر کب
ایذا جو چار دن ہو تو شکوہ نہ چاہیے

مگر کبھی کبھی ہجوم مصائب سے زبان پر قابو نہیں رہا اور دل کا درد شعر بن کر ظاہر ہو گیا۔ مثلاً ؎

انھیں کے لیے ہے زمانے کی سختی
بڑے رنج شیریں زباں کھینچتے ہیں

کس طرح نہ تلخ زندگانی ہو جائے ۔ پتھر پہ یہ دکھ پڑیں تو پانی ہو جائے
اس دم جو شریکِ دردِ ہو دے میرا ۔ خورشید کا رنگ آسمانی ہو جائے

دشمنوں کی دشمنی اور حاسدوں کے حسد سے ان کو جو تکلیفیں پہنچتی تھیں، ان کا بھی کبھی کبھی اظہار کر دیتے تھے۔ مثلاً ؎

راحت کیا حاسدوں سے حاصل ہوتی ۔ لذتِ دنیا کی زہر قاتل ہوتی
اس وقت میں گو خضر مسیحا ہوتے ۔ دو چار گھڑی بھی زیست مشکل ہوتی

اے بادشہ کون و مکاں اور کسی ۔ اے عقدہ کشائے دو جہاں اور کسی
اب تنگ ہے دشمنوں کے ہاتھوں سے انیس ۔ یا حضرت صاحب الزماں اور کسی

میر انیس نے ایک مقام پر کہا ہے اور سچ کہا ہے ؎

کس طرح قدر مجھے اپنے سخن کی ہو انیس
مرتبہ مشک کا آہوئے ختن کیا جانے

لیکن ان کو اپنے کمال کا احساس بھی تھا۔ فرماتے ہیں ؎

اے زمیں مجھ کو حقارت سے نہ دیکھ
آسماں کا طرۂ دستار ہوں

وہ اپنے کمال میں مست رہتے اور اس کو سب سے بڑا عطیۂ الٰہی سمجھتے تھے۔ کہتے ہیں ؎

انیس اس قدر شورِ بختی کا شکوہ ۔ یہ دولت ہے تھوڑی کہ شیریں سخن ہے

زور سے اس کے لیا ہے ہم نے میدانِ سخن ۔ اور نیزہ ہاتھ میں غیر از قلم رکھتے نہیں
یہ دوات و خامہ ہے ملک فصاحت کا نشاں ۔ کون کہتا ہے کہ ہم طبل و علم رکھتے نہیں

مگر اپنے کمال شاعری سے زیادہ مداحیِ امام حسین پر ناز تھا اور اپنے کمال کو انھی مداحی کا فیض سمجھتے تھے۔ فرماتے ہیں ؎

شہرہ ہر سو جو خوش کلامی کا ہے ۔ باعث مدح امام نامی کا ہے
میں کیا، آواز کیسی، پڑھنا کیسا ۔ آقا یہ شرف تری غلامی کا ہے

میر صاحب حوصلہ مند اور ذی ہمت آدمی تھے۔ وہ دنیا کی دل فریبیوں پر غالب آ کر اپنی فتح مندی کا لطف اٹھاتے تھے۔ کہتے ہیں ؎

بہت زالِ دنیا نے دیں بازیاں   میں وہ نوجواں ہوں کہ ہارا نہیں

ان کا جوش اور ولولہ بڑھاپے میں بھی انھیں جوان طبیعت بنائے ہوئے تھا۔ فرماتے ہیں ؎

گھٹا زورِ مشق سخن بڑھ گئی   ضعیفی نے ہم کو جواں کردیا

گو پیر ہوں پر زورِ جوانی ہے ابھی تک   سوکھے ہوئے دریا میں روانی ہے ابھی تک

دنداں نہیں پر تیز زبانی ہے ابھی تک   قبضے میں وہ تیغ صفہانی ہے ابھی تک

شاعروں کو اپنی شاعری میں اپنی تعریف کرنے کا حق جو دستورِ قدیم نے دے رکھا ہے اس سے میر انیس بھی فائدہ اٹھاتے تھے۔ لیکن اصولاً وہ خود ستائی کو مذموم سمجھتے تھے۔ فرماتے ہیں ؎

لازم نہیں اپنے منھ سے تعریف انیس   خالص جو ہے مُشک آپ بو دیتا ہے

کرتے ہیں تہی مغز ثنا آپ اپنی   جو ظرف کہ خالی ہے صدا دیتا ہے

میر انیس نے اپنی شاعری کی تعریف سات آٹھ جگہ سے زیادہ نہیں کی ہے اور ان کے کلام کی مقدار کو دیکھتے ہوئے یہ نہ ہونے کے برابر ہے۔ چند مقامات نقل کیے جاتے ہیں۔ ان کو سنیے اور دیکھیے کہ ایک شاعر اپنی شاعری کی تعریف بھی کیسے شاعرانہ انداز میں کرتا ہے ؎

نمک خوانِ تکلم ہے فصاحت میری   ناطقے بند ہیں سن سن کے بلاغت میری

رنگ اڑتے ہیں وہ رنگیں ہے عبارت میری   شور جس کا ہے وہ دریا ہے طبیعت میری

عمر گزری ہے اسی دشت کی سیاحی میں

پانچویں پشت ہے شبیر کی مدّاحی میں

ایک قطرے کو جو دوں بسط تو قلزم کردوں   بحرِ مواج فصاحت کا تلاطم کردوں

ماہ کو مہر کردوں، ذرّوں کو انجم کردوں   گنگ کو ماہر اندازِ تکلم کردوں

دردِ سر ہوتا ہے بے رنگ نہ فریاد کریں

بلبلیں مجھ سے گلستاں کا سبق یاد کریں

قلمِ فکر سے کھینچوں جو کسی بزم کا رنگ   شمع تصویر پہ گرنے لگیں آآ کے پتنگ

صاف حیرت زدہ مانی ہو تو بہزاد ہو دنگ   خوں برستا نظر آئے جو دکھاؤں صفِ جنگ

رزم ایسی ہو کہ دل سب کے پھڑک جائیں ابھی
بجلیاں تیغوں کی آنکھوں میں چمک جائیں ابھی

کم ہے جو اس سخن پہ جواہر کریں نثار
بہتر ہے موتیوں سے تری نظم آب دار
سچ ہے یہ طرز خاص کوئی جانتا نہیں
جو جانتا ہے اور کو وہ مانتا نہیں

ہر جا ہے ملک نظم میں نظم و نسق مرا
کہتے ہیں انتظام جسے ہے وہ حق مرا
ہے سہل ممتنع وہ کلام ادق مرا
برسوں پڑھیں تو یاد نہ ہووے سبق مرا
پائی نہیں کبھی یہ حلاوت نبات میں
مضمون نوٹپک رہے ہیں بات بات میں

بلبل نے ایسے نغمۂ رنگیں سُنے نہیں
دامن میں ہیں وہ گل جو کسی نے چنے نہیں
کسی نے تری طرح سے اے انیس
عروس سخن کو سنوارا نہیں
سبک ہو چلی تھی ترازوے شعر
مگر ہم نے پلہ گراں کر دیا
مری قدر کر اے زمین سخن
تجھے بات میں آسماں کر دیا
میں باعث نغمہ سنجیٔ بلبل ہوں
کھولے نہ کبھی منھ جو زباں بند کروں
یہ شرط ہے کہ نہ دعویٰ کروں طلاقت کا
کسی کی تیغ جو بڑھ کر مری زباں سے چلے

میر انیس اپنے حریفوں پر چوٹیں کرتے تھے مگر صرف اپنی شاعری میں اور وہ بھی عمومیت کے انداز میں۔ میر صاحب کے دیکھنے والوں اور ان کی صحبت میں بیٹھنے والوں کا بیان ہے کہ وہ اپنے کسی ہم عصر شاعر کے کلام پر کبھی اعتراض نہیں کرتے تھے۔ ان کے اس شعر سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ وہ نکتہ چینی کو پسند نہیں کرتے تھے ؎

غلط یہ لفظ، وہ بندش بری یہ مضموں سست
ہنر عجیب ملا ہے یہ نکتہ چینوں کو

وہ کوئی ایسی بات نہیں کرنا چاہتے تھے جو کسی کو ناگوار ہو۔ فرماتے ہیں ؎

سخن ہے اگر باعث تلخ کامی
تو ہم آپ اپنی زباں کھینچتے ہیں

ان کی حریفانہ چوٹوں کا انداز یہ تھا ؎

لکھے انیس میں نے بہ سرعت یہ چند بند — لے جائے شوق سے جسے مضموں ہو جو پسند
اک جا ہے شیر و شکر و شہد و نبات و قند — اس کے کرم سے ہوگا یہ دریا کبھی نہ بند

نہریں رواں ہیں فیض شہ مشرقین کی
پیاسو پیو سبیل ہے نذر حسین کی

ہیں بلبل گلزار سخن اور بھی دو چار — انصاف کریں پر گل مضموں کے طلبگار

گلدستۂ معنی کے ذرا ڈھنگ کو دیکھیں
بندش کو، نزاکت کو، نئے رنگ کو دیکھیں

جوہر شناس تیغ زباں منھ ادھر کریں — تیزی کو حرف حرف کی مد نظر کریں
دشمن ہزار سینے کو اپنے سپر کریں — مصرعے وہ جاں گداز ہیں کہ ٹکڑے جگر کریں

بیتوں میں ذوالفقار کی سب آب و تاب ہے
بین السطور تیغ حسینی کی تاب ہے

کٹ جاتے ہیں خود رنگ بدلنے والے — کب تھکتے ہیں جو اشک ہیں ڈھلنے والے
اللہ رے ترے سخن کی تاثیر انیس — رو دیتے ہیں مثل شمع جلنے والے

مضمون انیس کا نہ پھیکا اترا — اترا کبھی تو کچھ بگڑ کے نقشا اترا
نقاش نے سو طرح کی خفت کھینچی — تصویر نہ کھنچ سکی تو چہرا اترا

کس دن مضمون نو کا نقشا اترا — پر دزد معانی کا نہ چہرا اترا
منبر پہ گئے ہم نئے مضموں لے کر — ان کے لیے گویا من و سلویٰ اترا

کانپا نہ جگر، نہ دل، نہ چہرا اترا — کس بحر میں بے خوف و خطر جا اترا
ساحل پہ نہ جب تک ٹھہرے یاروں کے قدم — دو ہاتھ لگا کے میں وہ دریا اترا

کب دزد سے دولت ہنر بچتی ہے — لے بھاگتے ہیں جب کہ نظر بچتی ہے
ممکن نہیں دزدان مضامیں سے نجات — سچ ہے کہ مگس سے کب شکر بچتی ہے

گلشن میں سخن کے زمزمہ پرداز ہوں کبھی — دم بند ہو گیا ہے مرے ہم صفیر کا
سوکھ کر کانٹا ہوا ہوں پر انیس — آنکھ میں دشمن کی اب تک خار ہوں

عجب کیا جو حاسد کا دل ہو نشانہ — کہ ہم دستانہ کماں کھینچتے ہیں
نوا سنجیوں نے تری اے انیس — ہر اک زاغ کو خوش بیاں کر دیا

لگا رہا ہوں مضامین نو کے پھر انبار　　خبر کرو مرے خرمن کے خوشہ چینوں کو
صبا لے کے جا میرے پھولوں کی بو　　دماغ عدو بھی معطر رہے
بہتا ہے انیس خون انصاف　　مضموں مرے قتل ہو رہے ہیں

اپنی تعریف سے کون خوش نہیں ہوتا، مگر میر انیس عوام کی تعریف کو تعریف نہیں سمجھتے تھے۔ فرماتے ہیں ؎

تعریف کریں خاص تو ہے کام کی تعریف　　کب مانتے ہیں اہل سخن عام کی تعریف
سب کچھ ہے آقا کے تصدق سے ملا ہے　　اس نظم کا تعریف سخن فہم صلا ہے
نافہم سے کب داد سخن لیتا ہوں　　دشمن ہو کہ دوست سب کی سن لیتا ہوں
گل سے بلبل کی خوش بیانی پوچھو　　ذی فہم سے لطف نکتہ دانی پوچھو
تو قیر کلام حق سمجھتا ہے کلیم　　موسیٰ سے رموز لن ترانی پوچھو

میں نے میر انیس کی سیرت کے بیان میں سند کے طور پر ان کے اشعار کثرت سے نقل کیے ہیں۔ اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ میں نے اس بیان کا ماخذ صرف کلام انیس کو قرار دیا ہے اور اگر ایسا کرتا تو بھی نتائج بیشتر درست ہی نکلتے۔ ہر شاعر کے ہر شعر سے اس کی سیرت پر استدلال کرنا صحیح نہیں ہو سکتا۔ لیکن جن مضامین کو کوئی شاعر بار بار نظم کرتا ہو اُن سے اُس کے خیالات کا کچھ اندازہ ضرور ہو جاتا ہے۔ پھر جن شاعروں نے اپنے خیالات نظم کر کے خود رکھ لیے ممکن ہے کہ وہ ان کی طبیعت اور ان کے عمل کا صحیح عکس نہ ہوں۔ لیکن انیس نے جو بات کہی ڈنکے کی چوٹ پر کہی، ہزاروں آدمیوں کی بھری محفلوں میں سنانے کے لیے کہی۔ ایسی صورت میں اگر وہ اپنی طبیعت اور عمل کے خلاف خیالات کا اظہار کرتے تو انگشت نمائی کے سوا اور کیا حاصل ہوتا۔ اس کے علاوہ اکثر باتیں ایسی کہی ہیں کہ ان کا مصنوعی اظہار تو محال ہے ہی ان کو سچ کہنے کے لیے بھی بڑی اخلاقی جرأت کی ضرورت ہے۔ ظاہر ہے کہ میر انیس کا کوئی ذاتی اور مستقل ذریعۂ معاش نہ تھا۔ ان کے زمانے میں آج کل کی جمہوریت کا جھوٹا خیال بھی پیدا نہیں ہوا تھا۔ وسلے شہر کے اثر اور اقتدار کی کوئی حد نہ تھی اور میر صاحب کا گزارہ صرف امرا کی داد و دہش پر تھا۔ امیروں کو ہمیشہ خوشامدیوں اور حاجتمندوں سے سابقہ پڑتا ہے جن کی خوشامدوں اور نیازمندیوں سے ان کی عادتیں بگڑ جاتی

ہیں۔ انیسؔ کے زمانے کے امرا بالخصوص نہایت خوشامد پسند تھے۔ ایسی حالت میں میر انیسؔ نے قناعت و توکل، عزت نفس، مذمت عز و رعونت وغیرہ کے مضامین جس عنوان اور جس شان سے کہے وہ انھیں کا کام تھا۔ یہ نکتہ بھی قابل لحاظ ہے کہ مطلق قناعت اور محض عزتِ نفس کا بیان عام اور اصولی انداز میں نہیں کیا ہے بلکہ اکثر خاص اپنی قناعت، خاص اپنی خودداری کا ذکر اس ٹھاٹھ سے کیا ہے اور نتائج کی طرف سے آنکھیں بند کر کے امیروں اور نوابوں کے منھ پر بھرے مجمعوں میں کیا ہے کہ ان کے خیالات کی سچائی میں کوئی شبہ باقی نہیں رہ جاتا۔ ایسی مثالیں اوپر گزر چکی ہیں۔ یہاں چند اور لکھی جاتی ہیں ؎

اہل دولت سے نہیں مطلب انیسؔ | یاں توکّل ہے فقط اللہ پر

قطع امید ایک در سے گر ہوئی کچھ غم نہیں | اور کچھ ساماں کر دے گا خدا میرے لیے

جز خدا جھکتے نہیں ہم بادشا کے سامنے | ہاتھ پھیلائے تونگر کیا گدا کے سامنے

در پہ شاہوں کے نہیں جاتے فقیر اللہ کے | سر جہاں رکھتے ہیں سب ہم واں قدم رکھتے نہیں

انھیں مثالوں سے ایک بات اور بھی نکلتی ہے۔ خیال تو کیجیے کس کا منھ تھا کہ اس زمانے کے امیروں اور نوابوں کے سامنے اس طرح گستاخانہ کلام کرنے کی جرأت کر سکتا۔ اگر کوئی جرأت کرتا بھی تو عزت کیسی جان سلامت رکھنا بھی مشکل ہو جاتا۔ یہ وقار میر انیسؔ ہی کو حاصل تھا کہ لوگ ایسی ایسی باتیں سنتے تھے پھر بھی ان کی خدمت کو اپنا فخر جانتے تھے، اور جو رقم ان کے سامنے پیش کرتے تھے اس کو عطیہ نہیں بلکہ نذرانہ سمجھتے تھے۔ میر انیسؔ کے دیکھنے والے ابھی موجود ہیں۔ وہ بھی انیسؔ کے اقوال کو ان کی طبیعت کا صحیح عکس بتاتے ہیں۔

میر انیس کی خوش آوازی، خوش بیانی اور مرثیہ گوئی

میر انیس نہایت خوش آواز تھے۔ لکھنؤ کے ایک بزرگ سید محمد جعفر مرثیہ خوانی میں میر نفیس کے شاگرد تھے۔ ان کے والد سید آغا میر اس فن میں میر انیس کے شاگرد رشید تھے۔ ان کا پڑھنا میر انیس سے بہت مشابہ تھا۔ سید محمد جعفر نے اپنے لڑکپن میں میر انیس کو بارہا دیکھا اور مرثیہ پڑھتے سنا تھا۔ ان کا بیان ہے کہ میر انیس کی آواز میں جو دلکشی تھی وہ کسی انسان کا کیا ذکر کسی خوش الحان پرند اور کسی باجے کی آواز میں بھی نہیں ہے۔ جب کبھی وہ بے تکلف احباب کی صحبت میں کمرے کے اندر دروازے بند کر کے اپنے دادا میر حسن کی مثنوی بلند آواز سے پڑھتے تھے تو راہ گیر کھڑے ہو کر دیر دیر تک سنا کرتے تھے۔

میر انیس نے اپنے اس خداداد وصف کا ذکر یوں کیا ہے ؎

لہجہ سنو زبان فصاحت نواز کا
تارِ نفس میں سوز ہے مطرب کے ساز کا

اگر میر انیس نہایت خوش لہجہ نہ ہوتے تو بھرے مجمع میں اپنی آواز کی تعریف کر کے لوگوں کو اپنے اوپر ہنسنے کا موقع نہ دیتے۔ ان کے حریف مرزا دبیر مغفور بہ قول مصنف حیاتِ دبیر "سینے کے زور سے پڑھتے تھے۔"... "آواز بھاری اور پاٹ دار تھی"[1] وہ خود فرماتے ہیں ؎

آواز ہو بھاری تو ہو، پر بات یہ ہے ‌ ‌ ‌ مجلس میں سخن نہ بارِ خاطر ہوئے[2]
ابنِ شہِ مرداں کا ثنا خواں ہوں میں ‌ ‌ ‌ صد شکر کہ پڑھنا مرا مردانہ ہے[3]

میر انیس جتنے خوش آواز تھے اس سے کہیں زیادہ خوش بیان تھے۔ موافق اور مخالف

---

[1] حیاتِ دبیر حصہ اول ص۵۵ ۔ [2] اردو مرثیہ اور مرزا دبیر ص۲۲ ۔ [3] حیاتِ دبیر حصہ اول ص۵۶

کوئی شخص ایسا نہ تھا جو اُن کی خوش بیانی کا قائل نہ ہو یا اس وصفِ خاص میں ان کے کسی مقابل کو اُن سے بڑھ کر سمجھتا ہو۔ تعشق، جن کی خوش بیانی مسلّم ہے، ان کا قول ہے ؎

اگرچہ اور تعشق ہیں کہنے کو ہم عصر
مگر انیس سا کوئی نہ خوش بیاں دیکھا

میر انیس نے خود بھی اپنے اس وصف کا جا بجا شاعرانہ انداز میں ذکر کیا ہے مثلاً ؎

میں باعثِ نغمہ سنجی بلبل ہوں — کھولے نہ کبھی منھ جو زباں بند کروں
نوا سنجوں نے تری اے انیس — ہر اک زاغ کو خوش بیاں کر دیا

وہ اپنی خوش بیانی کو مدحِ امام کا فیض سمجھتے ہیں۔ فرماتے ہیں ؎

شہرہ ہر سو جو خوش کلامی کا ہے — باعث مدحِ امامِ نامی کا ہے
میں کیا آواز کیسی پڑھنا کیسا — آقا یہ شرف تری غلامی کا ہے

میری والدہ مرحومہ کے حقیقی ماموں مولوی عبد العلی کا بیان ہے کہ مرزا دبیر کی آواز بھدّی اور بھاری تھی۔ میر انیس کی آواز سبک اور تیز تھی۔ زیادہ بتاتا کوئی نہ تھا مگر انیس کا ہاتھ نسبتاً زیادہ اٹھتا تھا۔

خوش آوازی اور خوش بیانی کے علاوہ تقریر کا سب سے بڑا وصف یہ ہے کہ مقرر کی آواز کا اتار چڑھاؤ، چہرے کا تغیّر، آنکھوں کی گردش، اعضا کی حرکت یہ سب چیزیں موقع و محل کے مناسب ہوں۔ اس طرح تقریر کے ہر لفظ کا صحیح مفہوم سامعین کے ذہن نشین ہو جاتا ہے اور بہت کچھ جو لفظوں میں ادا ہو ہی نہیں سکتا وہ بھی ادا ہو جاتا ہے اور مقرر جو اثر سامعین پر ڈالنا چاہتا ہے وہی پڑتا ہے۔

میر انیس انتخاب الفاظ میں اپنا نظیر نہیں رکھتے، لیکن زبان میں وہ وسعت کہاں جو خیالات میں ہے۔ خیالات تو خیر بری بھلی طرح الفاظ میں ادا بھی ہو جاتے ہیں لیکن جذبات کا ادا کرنا صرف لفظوں کے ذریعہ سے تقریباً غیر ممکن ہے۔ اس کے لیے ان چیزوں سے مدد لینا ضروری ہے جن کا ذکر ابھی اوپر کیا گیا ہے۔

میر انیس کو خدا نے وہ تمام ذرائع حدِ کمال تک عطا فرمائے تھے جن سے کوئی شخص اپنے دل کے حالات اور خیالات دوسروں کے دل تک پہنچا سکتا ہے۔

وہ سب سے بڑا وصف جس کا اوپر ذکر گیا ہے تقریر کرنے والے کے لیے جس قدر ضروری ہے اتنا ہی کسی تحریر کے پڑھنے والے کے لیے بھی ضروری ہے اور تقریر کرنے والے کے لیے جتنا مشکل ہے تحریر کو پڑھنے والے کے لیے اس سے زیادہ مشکل ہے۔ اگر تقریر یا تحریر میں اپنے خیالات و جذبات ادا کرنا ہوں تو بھی مشکل ہے اور اگر دوسروں کے خیالات و جذبات ادا کرنا ہوں تو اور زیادہ مشکل ہے۔ تحریر میں نثر کا اس طرح پڑھنا بھی مشکل ہے اور نظم کا یوں پڑھنا اور بھی مشکل ہے۔

لکھنؤ کے مشہور بیرسٹر حامد علی خاں حامد مرحوم فن شعر خوانی کا ذکر کرتے ہوئے لندن کے پروفیسر ہارٹلے کی بابت لکھتے ہیں:۔

"پروفیسر ہارٹلے کی عمر اس وقت ۷۰ برس کی ہوگی۔ تمام عمر سوا شعر پڑھنے اور شعر پڑھنا سکھانے کے کوئی کام نہیں کیا۔ اکثر فرمایا کرتے تھے کہ چودہ گھنٹے روز صرف ہوتے ہیں۔ یہ بات برسوں کی مشق کے بغیر حاصل نہیں ہوتی کہ جو مضامین نظم میں پڑھے جائیں ان کے پڑھنے سے یہ معلوم ہو کہ جو کیفیتیں منظوم ہیں پڑھنے والے پر گزر رہی ہیں، اور ان کے اظہار میں کسی قسم کی بناوٹ نہ معلوم ہو۔"[1]

آگے چل کر اسی فن کے متعلق لکھتے ہیں:۔

"بڑی مشکل اس وقت پڑتی ہے جب ایک مصرعے میں متناقض الفاظ قریب قریب ہوں جیسے رنج و خوشی، تکلیف و آرام، محبت و عداوت، نفرت و رغبت وغیرہ وغیرہ۔ اس وقت لفظ رنج، حزن کی آواز سے پڑھنا اور پھر فوراً آواز و صورت بدلنا جس سے خوشی ظاہر ہو اور اس طرح بدلنا کہ گویا بلا قصد خود بخود آواز و صورت بدل گئی۔ محبت و رغبت اس آواز سے ادا ہو جس سے محبت ٹپکے اور پھر فوراً آواز میں وہ تغیر پیدا ہو جس سے عداوت و نفرت برسے۔ کسی استادِ کامل کے پڑھنے میں ان مقامات کا وہ لطف ملتا ہے کہ بیان سے باہر ہے۔ حق مغفرت کرے حضرت نفیس یاد آ گئے۔

"جب حضرت انیس نے انتقال فرمایا اس وقت میری عمر بہت کم تھی۔ میں

---

[1] حیاتِ دبیر جلد اول صفحہ ۴۲۱۔

نے حضرت انیس کو پڑھتے نہیں سُنا لیکن یہ سُنا ہے کہ بے مثل پڑھتے تھے۔ ویسا پڑھنے والا ہندوستان میں پیدا نہیں ہوا۔ میں نے جناب مونس کو بھی نہیں سُنا۔ لیکن جناب انس و نفیس کو سنا اور انگلستان سے واپس آنے کے بعد سُنا۔ انس خوب ہی پڑھتے تھے خصوصاً بین[1]۔

حامد علی خاں مرحوم نے شعر خوانی پروفیسر ہارٹلے کے سے ماہر فن سے باقاعدہ سیکھی تھی۔ وہ اس فن کے رموز و نکات سے واقف تھے اور انس و نفیس کی مرثیہ خوانی کے مدّاح تھے۔ افسوس ہے کہ انیس و مونس کا پڑھنا انھوں نے نہ سُنا۔ لیکن جن خوش نصیبوں نے ان چاروں باکمالوں کو پڑھتے سُنا ہے اُن کی متفقہ رائے ہے کہ میر انیس سب سے اچّھا اور بہت اچھا پڑھتے تھے۔ ان کے بھائیوں میں مونس، جنگ خوب پڑھتے تھے اور انس بین۔ اس دردناک انداز سے پڑھتے تھے کہ سخت سے سخت دل انسان گریہ کرنے پر مجبور ہو جاتا تھا۔

مرثیہ خوانی کا فن انیس کے والد میر خلیق سے شروع ہو کر انیس کے پوتے میر خورشید حسن عروج عرف دولھا صاحب پر ختم ہو گیا۔ اس خاندان کے بعض دوسرے افراد بھی اس فن میں استاذ زمانہ ہوئے۔ راقم نے اپنے عہد کے سب سے بڑے فن مرثیہ خوانی کے ماہر دولھا صاحب کو کئی مرتبہ سُنا ہے۔ ان کے ہم عصروں میں اس فن کے دو ماہر اور تھے اور وہ بھی خاندانِ انیس ہی سے تعلق رکھتے تھے۔ ایک میر انیس کی ایک صاحب زادی کے نواسے سید محمد ذکی تخلص بہ ذکی عرف منّے صاحب اور دوسرے میر انیس کے فرزند اکبر میر خورشید علی نفیس کے نواسے میر علی محمد عارف۔ میں نے ان دونوں باکمالوں کو بھی پڑھتے سنا ہے۔ یہ تینوں بزرگ اپنے ہی تصنیف کیے ہوئے مرثیے پڑھتے تھے۔

پنڈت برج نرائن چکبست مرحوم فرماتے تھے کہ میر نفیس کی مرثیہ گوئی اور مرثیہ خوانی کا شہرہ سُن سُن کر پنڈت بشن نرائن در[2] کو اشتیاق ہوا کہ میر صاحب کا کلام خود ان کی زبان سے سُنیں۔ ایک مجلس میں انھوں نے شرکت کی۔ میں بھی ہم راہ تھا۔ مجلس سے

---

[1] حیات دبیر جلد اول صفحہ ۴۳۳۔ [2] پنڈت بشن نرائن در فاضل بیرسٹر، انگریزی کے ادیب، اردو کے شاعر و نقاد، سیاسیات کے عالم اور زبردست مقرر تھے۔

واپس ہوتے ہوئے راستے میں انھوں نے مجھ سے کہا کہ یہ شخص ایکٹنگ کے فن میں انتہائی کمال رکھتا ہے۔ ہندوستان میں اس فن کے ماہر اور اس کے قدرشناس نہیں ہیں۔ اگر یہ باکمال انگلستان میں پیدا ہوا ہوتا تو اس کی شہرت تو دنیا بھر میں ہوتی ہی اُس پر روپیا برستا اور وہ امیر کبیر ہو جاتا۔

پنڈت بشن نرائن در نے سچ کہا کہ مرثیہ خوانی کا فن ایکٹنگ کا انتہائی کمال ہے۔ ایکٹر نقل کو اصل کر دکھانے کے لیے اسٹیج کے سازوسامان کا محتاج ہوتا ہے۔ ہر پارٹ کے لیے اس کو اُسی کے مناسب پوشاک، روپ، مقام اور دوسرے لوازم کی ضرورت ہوتی ہے۔ ایکٹر گویا صورت شکل، لباس، وضع قطع اور اپنے گردوپیش کی چیزوں میں بالکل ویسا ہی بن جاتا ہے جیسا وہ شخص جس کا کردار اُسے ادا کرنا ہے۔ اس کے علاوہ وہ اپنی چال ڈھال، بول چال، لب و لہجے میں بھی اُس کی پوری نقل اتارتا ہے۔ ان تمام سامانوں اور تدبیروں کے بعد بھی نقل کو اصل کر دکھانے میں پوری کامیابی مشکل سے ہوتی ہے۔ لیکن مرثیہ خوانی کا کمال دیکھیے کہ ایک شخص اپنے معمولی لباس اور اصلی صورت میں آتا ہے اور صرف لہجے کی تبدیلی، چہرے کے تغیر، جسم اور اعضا کی معمولی سی جنبش، آنکھ کی خفیف سی گردش سے ہر صنف، ہر عمر، ہر حیثیت، ہر استعداد، ہر ذہنی کیفیت والے انسان کی تصویر پیش کر دیتا ہے۔

ایکٹنگ اور مرثیہ خوانی میں ایک خاص فرق یہ ہے کہ ایکٹر خود کسی دوسرے شخص کی تصویر بن جاتا ہے۔ وہ اپنی ہستی کو اس شخص کی ہستی میں تبدیل بلکہ محو کر دیتا ہے۔ لیکن مرثیہ خواں کسی دوسرے شخص کی تصویر بھی پیش کرتا ہے اور اپنی ہستی کو بھی قائم رکھتا ہے۔ یہ بڑی نازک بات ہے۔ مثال کے طور پر یوں سمجھیے کہ مرثیہ خوان اگر کسی عورت کے خیالات و جذبات اسی کی زبان سے ادا کروانا چاہے اور اس غرض سے آواز اور لہجہ بالکل زنانہ اختیار کرے اور اعضا کی حرکتوں میں بھی عورتوں کی نقل کرے تو اس کا یہ فعل اس کی مردانی صورت اور مردانہ لباس کے ساتھ مضحکہ خیز ہو جائے گا اور صرف مسخرے پن کی شان دکھائے گا۔ مرثیہ خوان کچھ ایسا لب و لہجہ اور ایسے حرکات اختیار کرتا ہے کہ اہل مجلس کی آنکھیں مرثیہ خواں کی صورت دیکھتی ہیں اور کان اُس کے الفاظ سنتے ہیں لیکن اس کا ذہن کسی دوسری ہستی کی طرف منتقل ہو جاتا ہے اور وہ عالم

تصور میں اُس عورت کی آواز سنتا اور اسی کی حالت دیکھتا ہے جس کے خیالات و جذبات مرثیہ خواں اُسی کی زبان سے ادا کرنا چاہتا تھا۔ گویا اہلِ مجلس ایک ہی وقت میں دو صورتیں دیکھتے اور دو آوازیں سنتے ہیں۔ اس بیان کی توضیح معتبر شاہدوں کے چشم دید بیانات سے ہوگی جو آگے چل کر پیش کیے جائیں گے۔ ایکٹنگ کا یہی کمال ہے جو میر انیس کو قدرت نے اور دوسروں کو میر انیس نے سکھایا۔ میر انیس منبر پر بیٹھ کر تحت اللفظ پڑھنے کے موجد تو نہ تھے لیکن ان سے پہلے تحت اللفظ خوانی کو فن کی حیثیت حاصل نہ تھی۔ میر صاحب نے نہ صرف اُس کو ایک مستقل فن بنا دیا بلکہ مرثیہ گوئی کی طرح مرثیہ خوانی کو بھی اُس درجۂ کمال پر پہنچا دیا جس سے آگے بڑھنا ممکن نہ ہوا۔

میر انیس کی مرثیہ خوانی کا کمال دیکھ کر بعض لوگوں نے یہ قیاس کر لیا کہ وہ ایک بڑا آئینہ سامنے رکھ کر مرثیہ پڑھنے کی مشق کیا کرتے تھے۔ میر انیس اور ان کی خانگی زندگی سے ذاتی واقفیت رکھنے والے لوگ اس قیاس کو بے بنیاد بتاتے ہیں۔

شیخ حسن رضا مظفر پوری مرزا دبیر کے طرف داروں میں تھے۔ انھوں نے شبلی کی کتاب موازنۂ انیس و دبیر کی رد میں ایک رسالہ تردید موازنہ کے نام سے لکھا تھا۔ وہ اس رسالے میں لکھتے ہیں:

> "جناب میر انیس قبلہ مرحوم میں علاوہ کلام کی فصاحت کے اُس کلام کے ادا کرنے کا انداز بھی جناب مرحوم ممدوح ہی میں ایسا تھا جس سے کلام نورٌ علیٰ نور کا مصداق ہو جاتا تھا۔ افراط تفریط کا نام نہیں۔ نشست سے بالائے منبر قدرتِ خدا کے جلوے کی تصویر کھینچتے تھے۔ بنوٹ و تصنع کی ہوا تک نہ آنے پاتی تھی۔ تیور اور اشارات مہذبانہ جیسے اُن بزرگ سے ادا ہوئے آج تک کسی غیر سے تو کیا اُن کے خاندان میں کسی سے حتیٰ کہ اُن کی اولاد سے بھی وہ شان اور بات دیکھنے میں نہیں آئی...... بس فصاحتِ کلام کا رنگ اور پڑھنے کا ڈھنگ میر انیس مرحوم کے ساتھ ساتھ راہی جنت ہو گیا۔ نہ قبل ایسا کوئی گزرا ہے، میرے قیاس میں نہ آئندہ کوئی گزرے گا۔"[1]

---

[1] تردیدِ موازنہ جلد اول ص ۳۹-۴۰ مطبع تصویر عالم لکھنؤ

علی مرزا پٹنے کے ایک بزرگ تھے جن کی سخن فہمی کی بنا پر پٹنے کی مجلسوں میں مرثیہ پڑھتے وقت میر انیس ان کو اکثر مخاطب کیا کرتے تھے۔ ان کا بیان ہے:

"ایک بات میر انیس میں میں نے حیرت ناک دیکھی۔ جب وہ مرثیے کا کوئی مقام رقت انگیز پڑھتے تھے اور جوشِ رقت سے خود بھی بےچین ہو جاتے تھے تو ضبطِ گریہ کی غرض سے نیچے کے ہونٹ کو دانتوں میں دبا لیتے تھے، جس سے داہنی جانب کا رخسار متحرک ہوتا تھا اور یہ کوشش ان کو لاکھ لاکھ بناؤ دیتا تھا۔ اُن کو تو اس انداز سے یہی مقصود تھا کہ جوشِ گریہ سے آواز گلوگیر نہ ہو جو مانع خواندگی ہے، مگر قدرتاً اس دل فریب ادا کی چوٹ ہر دل کو بےچین کر دیتی تھی۔"[1]

مولفِ حیاتِ انیس نے میر انیس کی مرثیہ خوانی کے متعلق شمس العلما مولوی ذکاء اللہ کا چشم دید بیان یہ لکھا ہے:

"میں میر انیس کی فصاحت بیانی اور ان کے طرزِ بیان کی دل فریب اداؤں کی تصویر نہیں کھینچ سکتا۔ صرف اتنا کہہ سکتا ہوں کہ میں نے اس سے پہلے کبھی ایسا خوش بیان نہیں سنا اور نہ کسی کے ادائے بیان سے یہ مافوق العادت اثر پیدا ہوتے مشاہدہ کیا۔ میر انیس بوڑھے ہو گئے تھے مگر ان کا طرزِ بیان جوانوں کو مات کرتا تھا۔ اور معلوم ہوتا تھا کہ منبر پر ایک کل کی بڑھیا بیٹھی ہوئی لڑکوں پر جادو کر رہی ہے۔ جس کا دل جس طرف چاہتی ہے پھیر دیتی ہے۔ اور جب چاہتی ہے ہنساتی ہے اور جب چاہتی ہے رلاتی ہے۔ میں اسی حالت میں (یعنی دھوپ میں) دو گھنٹے کے قریب کھڑا رہا۔ میرے کپڑے پسینے سے تر اور پاؤں خون اُترنے سے شل ہو گئے تھے۔ لیکن جب تک میر انیس کی صورت دیکھتا اور اُن کا مرثیہ سنتا رہا مجھ کو یہ کوئی بات محسوس نہیں ہوئی۔"[2]

صاحبِ آبِ حیات نے مولوی ذکاء اللہ کے اس بیان کو یوں نقل کیا ہے:

"کمال اور کلام کی کیا کیفیت بیان کروں۔ محویت کا عالم تھا۔ وہ شخص

---

[1] واقعاتِ انیس صفحہ ۳۲۔ [2] حیاتِ انیس صفحہ ۲۴-۲۵۔

منبر پر بیٹھا پڑھ رہا تھا اور یہ معلوم ہوتا تھا کہ جادو کر رہا ہے[1]"
شمس العلماء مولانا آزاد نے خود بھی میر انیس کو لکھنؤ میں ۱۸۵۶ء میں دیکھا تھا۔
ان کا بیان ہے :۔

"اُن کی آواز، ان کا قد و قامت، ان کی صورت کا انداز، غرض ہر شے اس کام (مرثیہ خوانی) کے لیے ٹھیک اور موزوں واقع ہوئی تھی[2]"

میر انیس کا پڑھنا بھی انھوں نے سُنا تھا۔ لکھتے ہیں :۔

"میر انیس مرحوم کو بھی میں نے پڑھتے ہوئے دیکھا ہے۔ کہیں اتفاقاً ہی ہاتھ اٹھ جاتا ہے۔ یا گردن کی ایک جنبش یا آنکھ کی گردش تھی کہ کام کر جاتی تھی۔ ورنہ کلام ہی سارے مطالب کے حق پورے پورے ادا کر دیتا تھا[3]"

مرثیہ گوئی کی طرح مرثیہ خوانی بھی میر انیس نے اپنے والد میر خلیق سے سیکھی تھی۔ میر خلیق کی مرثیہ خوانی کے متعلق آزاد کا بیان ہے :۔

"ان کے ادائے کلام اور پڑھنے کی خوبی دیکھنے اور سننے کے قابل تھی۔ اعضا کی حرکت سے بالکل کام نہ لیتے تھے۔ فقط نشست کا انداز اور آنکھوں کی گردش تھی۔ اسی میں سب کچھ ختم کر دیتے تھے[4]"

شریف العلما مولوی سید شریف حسین نے حیدرآباد سے اپنے خط مورخہ ۲۱ ذی الحجہ ۱۲۸۷ھ (۱۳ مارچ ۱۸۷۱ء) میں لکھا ہے :

"حقیقت یہ ہے کہ جناب میر انیس کا پڑھنا دلوں کے لیے مقناطیس ہے۔ آج اپنے چند شعر پڑھے تھے۔ یہاں کے نافہم لوگ ہمہ تن گوش ہو گئے، اہل فن کا کیا ذکر"

میر انیس کے ہم عصر مرزا قادر بخش صابر دہلوی انیس کی مرثیہ خوانی کے متعلق لکھتے ہیں :۔

"تحت لفظ یعنی مرثیہ بغیر آہنگ موسیقی کے ایسی طرز سے پڑھتا ہے

---

[1] آب حیات صفحہ ۵۴۸۔ [2] آب حیات صفحہ ۵۴۹۔ [3] آب حیات صفحہ ۳۸۵۔
[4] آب حیات صفحہ ۳۸۴۔

گویا عنانِ اثر اُس کی صدائے دل سوز کے ہاتھ میں ہے[1]۔"

عبدالغفور خاں نسّاخ کلکتوی نے اپنے رسالے انتخابِ نقص میں میر انیس کے کلام پر بہت سے اعتراض کیے ہیں۔ وہ انیس کی شاعری کے قائل نہیں ہیں، لیکن اُن کی مرثیہ خوانی کی تعریف اِن لفظوں میں کرتے ہیں:

"مرثیہ گویوں میں ممتاز ہیں اور تحت لفظ پڑھنے میں کمال رکھتے ہیں[2]۔"

مشہور شاعر سید انور حسین آرزو لکھنوی اپنے والد میرزا ذاکر حسین یاسؔ کا بیان یوں نقل کرتے ہیں:۔

"غدر کے بعد ایک مدت تک میر انیس مرثیہ نہیں پڑھے۔ کئی برس کے بعد آغا ابّو صاحب کے والد نواب والاجاہ کے اصرار سے اُن کے یہاں مرثیہ پڑھا۔ کمال یہ کیا کہ ایک مرثیے کو دو دن دو دفعہ پڑھا۔ پہلے دن ایک طرح پڑھا تھا، دوسرے دن بالکل دوسری طرح پڑھا۔"

یاسؔ مرحوم کا ایک دوسرا قول بھی جناب آرزو نے یوں نقل کیا ہے:۔

"میر انیس نے یہ مصرع پڑھتے وقت

صحرا زمردی تھا پھریرے کے عکس سے

مرثیے کو اس طرح زرا سا پلٹ دیا کہ پھریرے کا لہرانا آنکھوں کے سامنے آگیا۔"

مرزا دبیر کے شاگرد سید فرزند حسن صفیر بلگرامی کا بیان ہے کہ میں کلام دبیر کا شیدائی تھا، انیس کے کمال کا قائل نہ تھا۔ ایک مرتبہ اتفاقاً انیس کی ایک مجلس میں شرکت ہوئی اور میں بے دلی سے ان کو سننے لگا۔ لیکن دوسرے ہی بند کی مندرجہ ذیل بیت ؎

ساتوں جہنم آتش فرقت میں جلتے ہیں ۔۔۔ شعلے تری تلاش میں باہر نکلتے ہیں[3]

---

[1] گلستان سخن صفحہ ۱۴۸۔ [2] سخن شعرا صفحہ ۵۶۔ [3] یہ بیت میر انیس کے اس مرثیے میں ہے جس کا مطلع ہے "جب لشکر خدا کا علم سرنگوں ہوا"۔ پورا بند حسب ذیل ہے ؎

حضرت علی اکبر شام کے ایک نامی پہلوان سے فرماتے ہیں:

غرّہ ہمیں نہیں تجھے دعویٰ ہو گر تو آ ۔۔۔ تیری طرف یزید ہماری طرف خدا

آمد تو دیکھی جنگ کے بھی کچھ ہنر دکھا ۔۔۔ مالک تجھے سقر میں بلاتا ہے جلد جا

ساتوں جہنم آتش فرقت میں جلتے ہیں ۔۔۔ شعلے تری تلاش میں باہر نکلتے ہیں

انھوں نے اس انداز سے پڑھی کہ مجھے شعلے بھڑکتے ہوئے دکھائی دینے لگے اور میں پڑھنا سننے میں ایسا محو ہوا کہ اپنے تن بدن کا ہوش نہ رہا۔ یہاں تک کہ جب ایک دوسرے شخص نے مجھ کو ہوشیار کیا تو مجھے معلوم ہوا کہ میں کہاں اور کس عالم میں ہوں۔

یہ واقعہ لکھنؤ میں بہت مشہور ہے کہ جب میر نفیس نے یہ مصرع پڑھا ع

وہ گرد اڑی، وہ جگر بند بوتراب آیا

تو تمام اہل مجلس خوف زدہ ہو کر گردن پھرا کے دیکھنے لگے۔ ان کو ایسا معلوم ہوا جیسے کوئی شیر آگیا ہے۔

احسن لکھنوی کا چشم دید بیان ہے کہ میر انیس نے جب یہ مصرع پڑھا ع

دانتوں میں شجاعانِ عرب ڈاڑھیاں دابے

"تو مرثیے کو زانو پر رکھ کر دونوں ہاتھوں کو ڈاڑھی کے قریب لا کر اس طرح گردش دی اور ہونٹوں میں فرضی ڈاڑھی کو دبایا کہ یہ معلوم ہوا کہ عرب کے شجاع سپاہیوں کی حالت جنگ میں جوش شجاعت کی تصویر کھینچ دی ہے"[1]

میر انیس پیری اور ضعیفی کے عالم میں بھی مرثیہ خوب پڑھتے تھے اور اس کو امام حسین کی تائید سمجھتے تھے۔ جیسا کہ ذیل کے شعروں سے ظاہر ہے ؎

یہ بزم اور یہ آج کا پڑھنا ہے یادگار — رعشہ ہے دست و پا میں لرزتا ہے جسم زار
وہ یوں پڑھے جسے نہ ہو طاقت کلام کی — تائید ہے حسین علیہ السلام کی

ایک دوسرے موقعے پر فرماتے ہیں ؎

یہ مرثیہ یہ مجلس غم یادگار ہے — پیری کے دلولے ہیں خزاں کی بہار ہے

آرزو مرحوم نے میر انیس اور میر نفیس کو پڑھتے سنا تھا۔ ان کا بیان ہے کہ میر انیس نے جب یہ بند پڑھا ؎

جب ساعت وداع امام غنی ہوئی — تھی بیبیوں کی جان پہ اس دم بنی ہوئی
حضرت چلے تو اور بھی سینہ زنی ہوئی — پردہ حرم سرا کا اٹھا روشنی ہوئی

چوتھے مصرعے پر بائیں ہاتھ سے اشارہ کر کے اس طرف اس نظر سے دیکھا کہ تمام حاضرین

---

[1] واقعاتِ انیس صفحہ ۳۷-۳۸

اسی طرف دیکھنے لگے اور میر نفیس نے جب یہ بیت پڑھی ؎

پریدہ طائر جاں یوں تھے خوف کھائے ہوئے
کہ جیسے شب کو اڑیں جانور ستائے ہوئے

تو ہاتھوں کو کچھ اس طرح حرکت دی کہ خوف سے اڑتی ہوئی چڑیاں دکھائی دینے لگیں۔

میر نفیس کا آخری زمانہ تھا۔ سن شریف اسّی سے متجاوز ہو چکا تھا۔ گہری گہری جھریوں اور گردن کے اوپر کی لٹکتی ہوئی کھال نے چہرے کو بھیانک کر دیا تھا۔ لیکن صبح کا منظر پیش کرتے وقت جب یہ مصرع پڑھا ؎

نقاب چہرے سے الٹے ہوئے وہ حورِ سحر

تو مرثیہ زانو پر رکھ کر دونوں ہاتھوں سے نقاب الٹنے کا اشارہ کچھ اس طرح کیا کہ وہی بوڑھا چہرہ حور کی تصویر معلوم ہونے لگا۔

مولوی عبدالحلیم شرر لکھتے ہیں :۔

"میر انیس نے مرثیہ گوئی کے ساتھ مرثیہ خوانی کو بھی ایک فن بنا دیا۔ یونانیوں کے بعض مقرروں اور خطیبوں کی نسبت سُنا جاتا ہے کہ وہ... آواز کے نشیب و فراز اور اوضاع و اطوار کے تغیرات سے گفتگو میں اثر پیدا کرتے تھے۔ اسلام کی اس طولانی عمر میں اس نہایت ضروری فن کو اصول کے ساتھ خاص میر انیس نے زندہ کیا۔ الفاظ کے مناسب آواز کے تغیّرات اور مضامین کے موافق چہرہ بنا لینے اور کلام کو اعضا و جوارح کے مناسب حرکات اور خط و خال کے اشارات سے قوت دینے کا فن خاص لکھنؤ کی اور وہ بھی میر انیس کے گھرانے کی ایجاد ہے[1]۔"

راقم الحروف نے لڑکپن میں جب پہلے پہل میر علی محمد عارف کو پڑھتے سُنا تو انھوں نے یزیدی فوج کی بھاگڑ کے بیان میں یہ بند پڑھا ؎

منھ سے بھاگو کی صدا سنتے ہی پیدل بھاگے	جو جواں فوج کے آگے تھے وہ اول بھاگے
گھوڑے بھی پھینک کے اسوار و نکوتل بھاگے	فربہی سے جو نہ چل سکتے تھے وہ پل بھاگے

---

[1] گزشتہ لکھنؤ صفحہ ۸۶۔

بھاگنے کے لیے آپس میں شتی لڑتے تھے
دم جو پھولے تھے تو ہر بار گرے پڑتے تھے[1]

اس کا یہ مصرع "فربہی سے جو نہ چل سکتے تھے وہ پل بھاگے" کچھ اس طرح پڑھا کر ان کی آواز اور جسم کی زرا سی جنبش سے بڑے موٹے موٹے پہلوانوں کا پھسڑ پھسڑ بھاگنا تصور کی آنکھوں کے سامنے آگیا۔

عارف صاحب کی ایک رباعی مجھے یاد رہ گئی ہے ؂

اب ہم ہیں نہ وہ شباب کی باتیں ہیں
اب ہیں بھی تو انقلاب کی باتیں ہیں
پیری میں جوانی کا بیاں اے عارف
کچھ ہوش میں آ، خواب کی باتیں ہیں

---

[1] یہ بند عارف صاحب کے اس مرثیے میں ہے جس کا مطلع یہ ہے ع

پھر ہے شمشیر زباں معرکہ آرائے سخن

میر عارف کا انتقال ۱۲ ذی حجہ ۱۳۳۴ھ کو پنج شنبے کے دن ہوا۔ عیسوی سن ۱۹۱۶ء تھا۔ اس مصرعے سے تاریخ نکلتی ہے ع

عارف انیسِ عہد، مثالِ نفیس بود

میر انیسؔ کے کچھ چشم دید حالات[1]

میر انیسؔ کے دیکھنے والوں میں دو بزرگ ایسے موجود ہیں جن کے بیانات میر انیسؔ کے متعلق نہایت معتبر سمجھے جا سکتے ہیں۔ ایک میر سید علی صاحب جو سید صاحب کے نام سے معروف ہیں اور میر انیسؔ کے حقیقی نواسے اور میر نفیسؔ کے خویش ہیں[2]۔ ان کی پیدائش سنہ ۱۲۶۴ھ کی ہے۔ اس لیے سال قمری کے حساب سے ان کی عمر اس وقت ۸۶ سال کی ہے۔ غدر کے دوسرے سال اپنی والدہ کے انتقال کے بعد سے جب کہ ان کا سن نو دس برس کا تھا وہ اپنے نانا میر انیسؔ کے ساتھ رہنے لگے اور ان کے انتقال کے وقت تک یعنی ۲۷ سال کی عمر تک انھیں کے ساتھ رہے۔ دوسرے بزرگ میری والدۂ مرحومہ کے حقیقی ماموں مولوی عبد العلی صاحب ہیں۔ لکھنؤ کے محلہ مفتی گنج کے رہنے والے ہیں مگر ایک مدت سے اناؤ میں قیام ہے۔ ان کے والد میر سلامت علی صاحب[3] مرثیہ خوانی میں میر انیسؔ کے رشید و عزیز شاگرد تھے۔ ان کی پیدائش سنہ ۱۸۴۳ء کی ہے۔ اس لیے شمسی سال کے حساب سے ان کا سن اب ۸۰ سال کا ہے جو قمری سال

---

[1] مطبوعہ ماہ نامہ ادب، لکھنؤ، نومبر سنہ ۱۹۳۱ء۔

[2] میر سید علی صاحب شاعر ہیں۔ مانوسؔ تخلص کرتے ہیں غزل کبھی نہیں کہی۔ صرف رباعیاں، سلام اور مرثیے کہے۔ میر انیسؔ اور میر نفیسؔ سے کلام پر اصلاح لینے کا فخر حاصل ہے۔ نمونۂ کلام کے طور پر ایک رباعی یہاں درج کی جاتی ہے ؎

مضطر ہوں کمال شیب کے آنے سے — قوت نہ رہی شباب کے جانے سے

رعشہ ہاتھوں کا یہ خبر دیتا ہے — دیکھو آب چھلکنے کو ہے پیمانے سے

[3] غالباً یہی میر سلامت علی صاحب ہیں جن کے متعلق جناب احسنؔ نے تحریر فرمایا ہے:

"میر سلامت علی صاحب لکھنؤ میں ایک بزرگ تھے جن کو میر انیسؔ مرحوم کے کلیات جمع کرنے کا شوق تھا اور انھوں نے اپنی تلاش سے میر انیسؔ کا اکثر ایسا کلام بہم پہنچایا تھا جو خود میر انیسؔ کے پاس نہ تھا۔" (واقعات انیسؔ ص ۹۲)

کے حساب سے ۹۰-۹۱ سال کے برابر ہوتا ہے۔ میں نے ان دونوں بزرگوں سے میر انیس کے حالات دریافت کیے۔ ان حضرات نے میرے سوالوں کے جو جواب دیے وہ ذیل میں درج کیے جاتے ہیں۔

مولوی عبد العلی صاحب کا بیان

مولوی عبد العلی صاحب کا بیان درج ذیل ہے:

"میر انیس کے شاگردوں میں آغا صاحب[1] سب سے اچھا مرثیہ پڑھتے تھے۔ ان کے بعد میرے والد کا نمبر تھا۔ میر انیس میرے والد کو بہت عزیز رکھتے تھے۔ میرے یہاں اکثر تشریف لاتے تھے۔ میں بچپن میں اُن کے گھر میں جاتا تھا۔ ان کی بیوی اور بیٹیاں میرے سامنے ہوتی تھیں۔ میر صاحب میرے والد کو اپنی پیش خوانی میں پڑھواتے تھے اور ان کے پڑھنے سے خوش ہو کر بچ کی صحبت میں فرماتے تھے کہ "بھیا اب کیا کھاؤ گے؟" میر صاحب کے پاس باہر سے فرمائشیں آتی تھیں کہ اپنے کسی شاگرد کو مرثیہ خوانی کے لیے بھیجیے تو وہ میرے والد کو اپنا شاگرد رشید کہہ کر بھیجتے تھے۔ ڈپٹی نعمت علی خاں کے یہاں میر صاحب نے میرے والد کو عشرہ پڑھنے کے لیے اناؤ بھیجا۔ مگر اس زمانے میں وہ خفقان کے مرض میں مبتلا تھے۔ تین چار دن کے بعد لکھنؤ واپس چلے گئے۔ کسی طرح نہ ٹھہرے۔

"میرے نانا میر اکبر علی میر انیس کے یہاں داروغہ تھے اور میرے ایک مختلف البطن بھائی راحت علی، جو ایک حرم کے پیٹ سے تھے، پہلے میر انیس کے یہاں نوکر تھے، پھر میاں عشق کے یہاں داروغہ ہو گئے تھے اور انھیں کا کلام پڑھنے لگے تھے۔ ان کی یہ حرکت میر صاحب کو بہت ناگوار تھی۔

"دیانت الدولہ جن کی کربلا لکھنؤ میں مشہور ہے وہ میر انیس کو بہت مانتے تھے۔ ان کی کربلا اور امام باڑے وغیرہ کا انتظام میر انیس کے اختیار میں تھا۔ ان کے یہاں کی

---

[1] چند سال ہوئے سید آغا میر مرحوم کے بیٹے میر محمد جعفر صاحب سے لکھنؤ کے محلہ رستم نگر میں نواب سید زکی علی خاں ہاتف کے مکان پر مجھ سے ملاقات ہوئی تھی۔ قدیم وضع کے مُسن بزرگ ہیں۔ مرثیہ خوانی کے فن میں میر نفیس مغفور کے شاگرد ہیں۔ ادیب

مجلسوں میں میں نے میر انیس اور میر مونس کو برف کی قلفیاں تقسیم کرتے دیکھا ہے۔ بادشاہی ترچھا رسالہ دیانت الدولہ کے سپرد تھا۔ میر انیس کی سفارش سے میرے چھوٹے ماموں میر امیر علی اُس رسالے میں نوکر ہو گئے تھے۔ میرے خسر میرزا ذاکر علی خوش نویس نے دیانت الدولہ کی کربلا لکھی تھی۔ اس کے صلے میں دیانت الدولہ ان کو ایک گاؤں دینا چاہتے تھے مگر اس زمانے میں زمین کی قدر نہ تھی۔ اس لیے انھوں نے نقد صلے کی درخواست کی۔ وہ پہلے سعادت گنج میں رہتے تھے مگر یہ صلہ پانے کے بعد انھوں نے بھی مفتی گنج میں مکان بنا لیا تھا۔

دیانت الدولہ کی کربلا بہت مقبول سمجھی جاتی تھی۔ کربلائے معلی کے جانے والے پہلے ثواب کی نظر سے دیانت الدولہ کی کربلا میں دو تین دن قیام کرتے تھے۔ میرے چچا اور چچی دونوں کربلائے معلی گئے تھے۔ انھوں نے بھی دیانت الدولہ کی کربلا میں قیام کیا تھا۔ اُس زمانے میں لکھنؤ سے بمبئی تک بیل گاڑی کا کرایہ سو روپیا تھا۔

" میر انیس کا مکان اور امام باڑہ شیدیوں کے احاطے میں تھا۔ شیدیوں کا احاطہ مفتی گنج سے دور مشرق کی سمت شاہی مکانات کی طرف تھا۔ غدر کے بعد جب انگریزوں نے شاہی مکانات کھدوا ڈالے تو انھیں کے ساتھ وہ احاطہ بھی کھد گیا۔ اس کے بعد انیس سبزی منڈی میں رہنے لگے۔ شیدیوں کے احاطے سے پہلے میر صاحب کسی دوسرے محلے میں رہتے تھے اور اسی محلے کے قیام کے زمانے میں میرے نانا ان کے یہاں داروغہ تھے۔

" میر انیس کا قد لمبا، میانہ سے کچھ زیادہ تھا۔ ان کا بدن چست، ٹھوس اور پھریرا تھا اور رنگ گندمی تھا۔ میر انیس ہمیشہ کرتا پہنتے تھے۔ پائجامہ عرض کا سفید ہوتا تھا۔ انس اور مونس ریشمی پائجامے پہنتے تھے۔ ممکن ہے کہ میر انیس بھی ریشمی پائجامہ پہنتے ہوں مگر مجھے سفید ہی یاد ہے۔ زردوزی کام کا گھیتلا جوتا پہنتے تھے۔ داڑھی منڈواتے تھے۔ کچھ کچھ خیال ہوتا ہے کہ ایک مرتبہ دیانت الدولہ کی کربلا میں میں نے میر صاحب کو انگرکھا پہنے دیکھا تھا۔

" میں نے میر انیس کو دیانت الدولہ کی کربلا میں اور داروغہ محمد خاں کے مکان میں مرثیہ پڑھتے سُنا ہے۔ مفتی گنج بہت بڑا اور بہت آباد محلہ تھا۔ اس کے مختلف حصوں کے الگ الگ نام تھے۔ میرا مکان اس حصے میں تھا جو گرجی بیگ خاں کی چھاؤنی کہلاتا تھا اور داروغہ محمد خاں کا مکان اس حصے میں تھا جو مرزا علی خاں کا احاطہ کہلاتا تھا۔ داروغہ محمد خاں کے یہاں کی مجلس میں جب تک میر انیس پڑھتے رہتے تھے داروغہ صاحب

منبر کی داہنی طرف کھڑے ہوئے پنکھا جھلا کرتے تھے۔

• وزیر خاں نواب علی نقی خاں کے چیلے تھے۔ ان کے یہاں کی مجلس، مرزا دبیر پڑھتے تھے۔ وزیر خاں اور داروغہ محمد خاں کے یہاں کی مجلسیں مقابلے کی مجلسیں سمجھی جاتی تھیں۔ انیس اور دبیر دونوں کی شہرت برابر تھی۔ دونوں کے یہاں مجمع برابر ہوتا تھا۔ کوئی دو دو ہزار آدمی ہوتے ہوں گے۔ مکان مجلس کے سامنے فینسوں اور بگھیوں کا ہجوم ہوتا تھا۔

• مرزا دبیر کی آواز بھدی اور بھاری تھی۔ میر انیس کی آواز سبک اور تیز تھی۔ زیادہ بتاتا کوئی نہ تھا، مگر انیس کا ہاتھ نسبتاً زیادہ اٹھتا تھا۔ میں نے نہ خود کبھی دیکھا نہ کبھی کسی سے سُنا کہ میر صاحب آئینہ سامنے رکھ کر مرثیہ خوانی کی مشق کرتے تھے۔

"میر انیس کے بیٹوں میں میر نفیس کا پڑھنا سب سے اچھا اور باپ کے پڑھنے سے مشابہ تھا۔ سلیس کا پڑھنا باپ سے مشابہ نہ تھا۔ وہ ہاتھ کو بہت حرکت دیتے تھے۔ رئیس کا پڑھنا بالکل معمولی تھا۔

"میر انیس کئی مجلسوں میں پڑھنے کے بعد مرثیہ تقسیم کرتے تھے۔ میرے والد کو مرثیے جمع کرنے کا بڑا شوق تھا۔ گھر میں کھانے کی تنگی ہو تو بھی مرثیہ ضرور خرید لیتے تھے اور معاوضہ دے دے کر نقل کرنے کے لیے مرثیے حاصل کرتے تھے۔

"میر انیس نذرانے کے طور پر کوئی رقم قبول نہ کرتے تھے اور ملازمین کو سخت تاکید تھی کہ جو امراء اور نواب اُن سے ملنے آتے تھے اُن سے کچھ نہ لیں۔ میر صاحب سیر چشم آدمی تھے مگر خرچ میں ذرا کفایت بھی ملحوظ رکھتے تھے[1]۔"

---

[1] چند باتیں مولوی عبدالعلی صاحب سے اور معلوم ہوئیں جو میر انیس سے کوئی تعلق نہیں رکھتیں لیکن اس زمانے کے حالات پر روشنی ڈالتی ہیں۔ وہ بھی انھیں کی زبانی ذیل میں نقل کی جاتی ہیں۔

• میرے دادا لکھنؤ میں بادشاہی سوار تھے۔ میرے والد کا پیشہ ذاکری تھا اور محمد اکبر کمیدان کی پلٹن میں بھی نام تھا۔ میر فرزند علی توپ خانے کے داروغہ تھے اور میرے رشتے کے ایک بھائی مرزا امان علی بیگ توپ خانے سے متعلق تھے۔ ان کی سفارش سے میر فرزند علی نے میرا اور میرے والد کا نام گولہ اندازوں میں لکھ لیا تھا۔ جب کبھی سال چھ مہینے کے بعد تنخواہ بٹتی تھی تو میرے والد بھی جا کر لے آتے تھے۔ میرے والد نے ایک اسامی مول لے کر منور علی کا اسم میرے نام کروا دیا تھا۔ گولہ اندازوں کی تنخواہ چھ روپے مہینہ اور پلٹن کے سپاہیوں کی تنخواہ غالباً تین چار روپے مہینہ تھی۔

میر سید علی کا بیان

میر سید علی صاحب کا بیان درج ذیل ہے:

"میر انیس پہلے شیدیوں کے احاطے میں رہتے تھے۔ پھر دریائے گومتی کے قریب محلہ سبزی منڈی میں قیام کیا۔ یہاں دو مکان اور ایک امام باڑہ دیانت الدولہ نے بنوا دیا تھا۔ مکانوں میں ایک دیوان خانہ یعنی مردانہ مکان تھا اور ایک باورچی خانہ تھا اور امام باڑہ مکان مسکونہ کا بھی کام دیتا تھا۔ یہ امام باڑہ غدر سے چار سال پہلے بنا تھا اور غدر میں کھد گیا۔ امام باڑے کے لیے چاندی کی ضریح، شیشہ آلات اور فرش وغیرہ بھی دیانت الدولہ نے دیا تھا۔ غدر کے بعد میر انیس نے پنجابی ٹولہ میں راجہ کی بازار کے قریب منشی سراج الدین کا مکان دس روپے ماہوار کرائے پر لیا تھا۔ اس کے بعد سبزی منڈی والا گھسن آئینہ ساز سے تین ہزار تین سو روپے کا خریدا۔ اس مکان کے متعلق ایک احاطہ بھی تھا۔ اس کے ایک حصے میں میر انیس نے دیوان خانہ بنوا لیا اور ایک حصے میں میر نفیس نے اپنے صرف سے ایک مکان تعمیر کروایا۔ یہ تینوں مکان ابھی موجود ہیں۔ میر انیس کا مکان اور دیوان خانہ ان کے ورثا سے میر علی محمد صاحب عارف مرحوم نے خرید لیا اور اب ان کی اولاد اس پر قابض ہے۔ میر نفیس کے مکان میں ان کے پوتے سید محمد حسن صاحب فائز عرف لڈن صاحب رہتے تھے۔

"میر انیس بالعموم گھٹنوں سے کچھ نیچا کرتا پہنتے تھے۔ زیادہ سردی کے زمانے میں انگرکھے کی قطع کا دگلا یا خوب گھیر دار لبادہ بھی پہن لیتے تھے جو گٹوں تک پہنچتا تھا۔ پائجامہ گرمیوں میں سفید، اور جاڑوں میں مشروع یا گلبدن کا پہنتے تھے جس کا رنگ زیادہ تر سبز یا اودا ہوتا تھا۔ ہاتھ میں رومال اکثر رکھتے تھے۔ کبھی کبھی دوپٹہ آڑا کر کے کندھے پر ڈال لیتے تھے۔ جوتا گھیتلا پہنتے تھے۔ گھر میں زرد مخمل کا سادہ اور باہر کارچوبی جس کی قیمت پچیس تیس روپے ہوتی تھی۔ گرمیوں میں انگرکھا کبھی نہیں پہنتے تھے۔[1]

---

[1] اشہری صاحب نے لکھا ہے کہ "ٹوپی کی درستی اور خوب صورتی سے لگانے میں اُن (میر انیس) کو بڑی دلچسپی رہتی تھی۔ جب وہ کہیں تشریف لے جاتے تو گودوں پر چڑھی ہوئی آٹھ دس ٹوپیاں حاضر کی جاتیں۔ وہ جس کو پسند فرماتے اس کو سر پر رکھتے اور آئینہ سامنے رکھ کر اس کو بار بار درست کرتے جب تک وہ صحیح موزونیت حاصل نہ کرتی وہ اس شغل سے باز نہ آتے۔ بعض مرتبہ ایک ایک گھنٹہ (باقی حاشیہ صفحہ ۵۶ پر)

"میر انیس کو چھڑیوں کا بہت شوق تھا۔ لوگ ان کے لیے مرشد آباد سے ہرنوتیاں تحفے کے طور پر لاتے تھے۔ ان کے پاس پچاس ساٹھ ہرنوتی کی جریبیں تھیں۔ ٹین کے چونگلوں میں تیل بھر کر ان میں یہ جریبیں ڈبوئی جاتی تھیں اور رات کو نکال کر اوس میں رکھی جاتی تھیں کہ ان میں عنابی رنگ پیدا ہو۔ جریبوں پر چاندی کی شام ہوتی تھی اور بعض پر سونے چاندی کے تار بندھے ہوئے تھے۔

"میر انیس قریب قریب ساری رات جاگتے تھے۔ نماز صبح پڑھ کر آرام کرتے تھے کوئی نو بجے سو کر اٹھتے تھے۔ دس گیارہ بجے کھانا کھاتے تھے۔ اس کے بعد میر مونس اور میر نفیس کے کلام پر اصلاح دیتے تھے۔ دو بجے کے قریب پھر آرام کرتے تھے۔ عصر کے وقت اٹھتے تھے اور نماز سے فارغ ہو کر دیوان خانے تشریف لے جاتے تھے اور کھانا کھانے کے بعد مرثیے کی تصنیف میں مشغول ہو جاتے تھے۔ مرثیہ کہنے کے وقت مکان کے جنوبی رخ کے دوسرے درجے میں تخت پر بیٹھتے تھے۔ سامنے کنول روشن رہتا تھا، پہلوؤں میں کتابیں ہوتی تھیں۔ زیادہ تر دو زانو بیٹھتے تھے جب کچھ سوچنے لگتے تو اکثر کہنیاں زانوؤں پر ہوتی تھیں اور رخسار ہاتھوں پر۔ مرثیہ گوئی کا مشغلہ نماز صبح کے وقت تک جاری رہتا تھا۔ یہ بالکل غلط ہے کہ میر انیس مرثیہ کہتے وقت چادر اوڑھ کر لیٹ جاتے تھے اور خود بولتے جاتے تھے اور کوئی دوسرا شخص لکھتا جاتا تھا۔ ممکن ہے کہ انھوں نے کبھی یہ بھی کیا ہو، لیکن یہ ان کا عام قاعدہ ہرگز نہ تھا۔

"میر انیس کے پاس کوئی دو ہزار کتابیں تھیں۔ دو بڑے بڑے صندوق کتابوں سے بھرے ہوئے تھے۔ انھوں نے غدر کے بعد شاہنامۂ فردوسی کا ایک نہایت عمدہ نسخہ مطلاّ، مصوّر بخط ولایت دو سو روپے کا خریدا تھا۔ جس زمانے میں میر انیس کا قیام پنجابی ٹولے میں تھا اس زمانے میں وہ میر علی اوسط رشک کا لغت اپنے ہاتھ سے نقل کرتے تھے۔

(بقیہ حاشیہ صفحۂ گزشتہ) ٹوپیوں کی تبدیل بدل اور اس شغل میں صرف ہو جاتا: سید صاحب فرماتے ہیں کہ یہ بیان صحیح ہے۔ صرف آخری جملہ مبالغہ آمیز ہے۔ مگر یہ واقعہ ہے کہ میر انیس کو ٹوپی پہننے میں اکثر معمول سے زیادہ دیر لگتی تھی۔ اس زمانے میں کپڑے اور روئی کے بنے ہوئے قالبوں پر ٹوپیاں چڑھائی جاتی تھیں اور ایسے قالب کو گولا ہی کہتے تھے۔

"یہ بات بالکل غلط ہے کہ میر انیسؔ آئینہ سامنے رکھ کر مرثیہ خوانی کی مشق کرتے تھے۔

غدر کے بعد غالباً[1] شہر کی تباہی سے متاثر ہو کر میر انیسؔ نے مرثیہ خوانی ترک کر دی تھی۔ کئی برس کے بعد پھر مرثیہ پڑھنا شروع کیا اور پہلی مجلس میں وہ مرثیہ پڑھا جس میں یہ مصرع ہے ع "جس طرح کہ نغمے کی صدا تار پہ دوڑے"۔ میر بندہ کاظم صاحب جاویدؔ[1] مرحوم کے والد نے اس مصرعے پر اعتراض کیا۔ اس کی خبر میر انیسؔ کو بھی پہنچی۔ میر صاحب نے شیخ علی عباس صاحب مرحوم کے یہاں کی مجلس میں اس مصرعے کو صحیح ثابت کیا اور عرفی کے اُس قصیدے سے اس کی سند پیش کی جس کا قافیہ رنگ، سنگ، جنگ وغیرہ[2] ہے۔ معترض صاحب بھی مجلس میں موجود تھے، ان سے مخاطب ہو کر کہا کہ "کیا آپ کو اس مصرع پر کچھ اعتراض ہے؟" انھوں نے دست بستہ معافی مانگی۔

"میر انیسؔ کا آخری مرض جس میں ان کا انتقال ہوا ضعف معدہ اور اسہال کبدی تھا۔ دق کی بیماری ان کو نہ تھی۔ واقعاتِ انیسؔ صفحہ ۱۲۹ میں ایک شعر اور تین رباعیاں جو انیسؔ کا آخری وقت کا کلام کہہ کر پیش کی گئی ہیں وہ بہت پہلے کی کہی ہوئی ہیں۔ مؤلف کتاب نے ان کے مضمون کی بنا پر یہ قیاس کر لیا ہے کہ وہ آخری وقت کا کلام ہے۔ مگر ان کا یہ قیاس صحیح نہیں۔ میر انیسؔ نے انتقال سے دو تین روز پہلے ایک سلام کہا تھا۔ اور میرے سامنے میر مونسؔ اور میر نفیسؔ کو سنایا تھا اس کا مطلع یہ تھا ؎

سب عزیز و آشنا نا آشنا ہو جائیں گے ۔۔۔ قبر میں پیوند جتنے ہیں جدا ہو جائیں گے

اس سلام کے بعد انھوں نے کچھ نہیں کہا۔

"اثرؔ صاحب نے لکھا ہے کہ میر انیسؔ نے "آخری مجلس نواب باقر علی خاں صاحب و نواب جعفر علی خاں صاحب کے شیش محل واقع لکھنؤ میں پڑھی۔ اس کے بعد پھر کسی مجلس میں پڑھنے کا اتفاق نہیں ہوا۔ اس مجلس میں جو مرثیہ آخری مرتبہ پڑھا وہ یہ

---

[1] میر بندہ کاظم صاحب جاویدؔ لکھنؤ کے ایک ممتاز و مشہور مرثیہ گو اور غزل گو تھے۔ فن شعر میں استادی کا مرتبہ رکھتے تھے۔ دس برس ہوئے کہ انتقال فرمایا۔

[2] غالباً سید صاحب کا مقصود ذہنی عرفی کا یہ شعر ہے جو ممدوح کے گھوڑے کی تعریف میں کہا گیا ہے

سبک رو دسے کہ چناں بردود بہ زخمۂ تار ۔۔۔ کہ نغمہ لب نہ کشاید بہ عرصۂ آہنگ

تھا' آتی ہے کس شکوہ سے رن میں خدا کی فوج'۔ سید صاحب نے اس سلسلے میں فرمایا کہ یہ صحیح ہے کہ شیش محل کی آخری مجلس میں میر انیس نے وہ مرثیہ پڑھا تھا جس کا پہلا لفظ بدل کر شہری صاحب نے لکھا ہے۔ میں خود اس مجلس میں شریک تھا لیکن یہ صحیح نہیں کہ وہی مجلس میر انیس کی آخری مجلس تھی۔ میر انیس نے آخری مجلس شیخ علی عباس صاحب مرحوم کے یہاں پڑھی تھی۔ مرثیہ یہ تھا ع ذوالحسرتا کہ عہد جوانی گزر گیا' میں اس مجلس میں شریک تھا"۔

"میر انیس کا ایک مشہور مرثیہ ہے ع 'جب قطع کی مسافت شب آفتاب نے' اس مرثیے کے بعض قلمی نسخوں میں یہ مطلع ملتا ہے ع 'جب آسماں پہ ختم ہوا دور جام شب' یہ دوسرا مطلع میر نفیس کا کہا ہوا ہے۔

"لکھنؤ میں ایک بزرگ آغا سید صاحب تھے جو میر انیس کا مرثیہ مجلس میں ایک مرتبہ سن کر زبانی یاد کر لیا کرتے تھے ان کے انتقال کو چودہ پندرہ برس ہوئے۔"

میر انیس کے ایک عقیدت مند رفیق کا بیان

خان بہادر نواب مولوی سید مہدی حسن صاحب رضوی لکھنؤ کے ایک ذی علم ذی اثر، معاملہ فہم اور حکام رس بزرگ تھے۔ ۲۳ جولائی ۱۹۵۵ء کو پچاسی برس کی عمر میں ان کا انتقال ہوا۔ کوئی پچیس برس ہوئے میں نے مرحوم خان بہادر سے دریافت کرکے ان کے والد میر حامد علی کے کچھ حالات اور میر انیس سے متعلق ان کے بیانات لکھ لیے تھے۔ یہی مستند حالات اور معتبر بیانات اس مضمون میں پیش کیے جا رہے ہیں۔ ادیب

میر حامد علی لکھنؤ میں ایک خوش حال شخص تھے۔ علوم عربی اور حدیث کی تعلیم اپنے زمانے کے فاضل، مقدس اور مولوی وضع رئیس اعظم نواب مرزا دالاجاہ سے حاصل کی۔ نواب صاحب شاعر بھی تھے۔ "عاشق" تخلص تھا۔ میر حامد علی بھی شعر کہتے تھے۔ "قمر" تخلص کرتے تھے اور اپنے انھیں استاد سے اصلاح لیتے تھے۔ وہ زیادہ تر غزلیں اور قصیدے کہتے تھے۔ اردو کے دو دیوان مرتب کیے، مگر آخر عمر میں خود ہی تلف کر دیے۔ ساری عمر کتب بینی اور علمی مشاغل میں صرف کی۔ حافظہ نہایت قوی تھا۔ ایک مرتبہ مطالعہ کرنے میں کتابوں کے مضامین اور بعض مقامات کی عبارتیں تک یاد ہو جاتی تھیں۔ وہ غزل میں میرؔ کو اور مرثیے میں انیسؔ کو سب سے بہتر سمجھتے تھے۔ ان کے کچھ اشعار ان کے فرزند خان بہادر نواب مولوی سید مہدی حسن رضوی کو یاد تھے، جو یہاں درج کیے جاتے ہیں:

شکایت ظلم کی، ذکر جفا کیا ۔۔۔ محبت جس سے کی اُس کا گلا کیا
بنے تھے خاک سے پھر ہو گئے خاک ۔۔۔ ہماری ابتدا کیا، انتہا کیا
رقیبوں پر نگاہِ لطف دیکھی ۔۔۔ ان آنکھوں سے ابھی دیکھیے کیا کیا

مطبوعہ سرفراز لکھنؤ ۹ نومبر ۱۹۶۵ء۔

حالِ دل آپ نے سنا ہوگا — جو بُرا ہے، وہ سب ادا ہوگا
رات آتی ہے ہجر کی، اے دل — پھر اس آفت کا سامنا ہوگا

نقشِ قسمت سے، سرگرانی ہے — ناتوانی سی ناتوانی ہے
حشر میں بھی تجھے نہ دیکھیں گے — لن ترانی سی لن ترانی ہے
اللہ اللہ رقیب پر صاحب — مہربانی سی مہربانی ہے

یہ طولِ عمل اور یہ پیرانہ سری ہو — اپنی بھی خبر کچھ نہیں، کیا بے خبری ہو
توشۂ عمل خیر ہے، تابوت سواری — کہتے ہیں کفن جس کو وہ رختِ سفری ہو
بخشش کی دعا مانگ ضعیفی میں خدا سے — پیری کی مناجات دعائے سحری ہو

رنج و غم سے نجات ہوتی ہے — موت میری حیات ہوتی ہے
روز کوچے میں تیرے اے ظالم — اک نئی واردات ہوتی ہے
شبِ فرقت پنہ بہ ذاتِ خدا — کس قیامت کی رات ہوتی ہے
اے قمرؔ دل نہ دو حسینوں کو — بے وفا ان کی ذات ہوتی ہے

آقا کے غلام منتظر ہیں — شیعوں کے امام منتظر ہیں
اے رکنِ رکینِ دینِ احمد — یہ رکن و مقام منتظر ہیں
مولا ہم کیا ہیں، آپ کے سب — آبائے کرام منتظر ہیں

کچھ اپنے کسی سے ہیں راز و نیاز — قمرؔ شمعِ محفل بھی خاموش ہے

وہ کبھی کبھی سلام بھی کہتے تھے مگر دوسروں کی فرمائش اور انھیں کے نام سے۔ سلام نہ کہنے کا خاص سبب یہ تھا کہ جن اصنافِ سخن کو میر انیسؔ سے باکمال شاعر نے اختیار کیا تھا ان میں طبع آزمائی کرنے کو اپنی حد سے تجاوز کرنا سمجھتے تھے۔ ایک مرتبہ ایک صاحب نے میر انیسؔ کے اُس مشہور سلام کی طرح میں سلام کہنے کی فرمائش کی، جس کا مطلع ہے ؂

ابتدا سے ہم ضعیف و ناتواں پیدا ہوئے　　اڑ گیا جب رنگ رخ سے، استخواں پیدا ہوئے

انھوں نے جواب دیا کہ میر انیس کی طرح میں سلام کہنا سوء ادب ہے، اس لیے میں ردیف بدل کر کہوں گا۔ اس سلام کے دو شعر یہ ہیں ؎

چشمِ تر نے متصل اشک رواں پیدا کیے　　ایک یوسف نے ہزاروں کارواں پیدا کیے

ماتمِ شبیر میں اٹھ اٹھ کے دودِ آہ نے　　آسماں کتنے ہی زیرِ آسماں پیدا کیے

ایک اور سلام کے چند شعر یہ ہیں ؎

سر پہ ہے بارِ گنہ، ہاتھوں میں دامانِ علی　　اس طرح محشر میں آتے ہیں غلامانِ علی

خیر مقدم کی صدا آتی ہے بیت اللہ سے　　دوشِ احمد پائے حیدر، اے زہے شانِ علی!

ان سے کچھ پرسش نہ ہوگی جن کا مدفن ہو نجف　　حشر میں کہہ دیں گے آکر ہم ہیں مہمانِ علی

حشر کا دن ہو، سجاوٹ ہو رہی ہے خلد کی　　غل ہے حوروں میں کہ آتے ہیں غلامانِ علی

منصف مزاج ایسے تھے کہ ایک مرتبہ نسیم دہلوی کی طرح میں غزل کہی اور اس کا اعتراف کیا کہ مجھ سے نسیم کا سا مطلع نہیں ہو سکا۔ اس غزل کے چند شعر درج ذیل ہیں ؎

قرآن کا بگڑنا دیکھتے ہو　　اٹھو محفل سے اب کیا دیکھتے ہو

ہوا کھانا ہے دنیا کی کوئی دم　　اب اس بیمار کو کیا دیکھتے ہو

مرے رونے پہ دشمن رو رہے ہیں　　یہ تم بیٹھے تماشا دیکھتے ہو

نسیم کا مطلع یہ تھا ؎

عجب سے کیا احبا دیکھتے ہو　　اسے دیکھو مجھے کیا دیکھتے ہو

آخری عمر میں ایک غزل کہی جس کے چند شعر یہ ہیں ؎

ابھی تھے تیرے در پہ جانے کے قابل　　مگر ہو گئے اب اٹھانے کے قابل

یہ بارِ گنہ، اس پہ انبارِ احساں　　بھلا اب یہ سر ہے اٹھانے کے قابل

گنہ تیرے مجرم نے اتنے کیے ہیں　　کہ بس تیرے ہی ہیں چھپانے کے قابل

تر کوئے جاناں میں بیٹھے ہوئے ہو　　بھلا خاک ہے یہ اڑانے کے قابل

عجب اتفاق یہ ہوا کہ جس دن یہ غزل کہی اسی کی رات کو ان پر فالج گرا اور اس کا مطلع ان کے حسبِ حال ہو گیا۔ فالج کے پہلے حملے سے بچ گئے، اور کوئی سال بھر اچھے رہے۔ اس کے بعد دوسرا حملہ ہوا جس سے جاں بر نہ ہو سکے۔ ۱۸۹۲ء میں پچپن یا

پچپن سال کی عمر میں انتقال کیا۔

میر حامد علی میر انیس سے بے حد عقیدت رکھتے تھے۔ سن میں ان سے بہت چھوٹے تھے مگر اپنی علمیت، سنجیدگی اور سلامت ذوق کی وجہ سے میر صاحب کے بے تکلف احباب میں شامل تھے۔ روزانہ رات کو دس بجے سے بارہ بجے تک میر انیس کی خدمت میں حاضر رہتے تھے۔ کبھی کبھی میر مونس یا میر نفیس بھی آجاتے تھے۔ ان کے سوا کوئی موجود نہ ہوتا تھا۔ ان صحبتوں میں زیادہ تر شعر و ادب کے متعلق گفتگو رہا کرتی تھی۔ اچھے اچھے اشعار پڑھے جاتے تھے اور ان پر تبصرہ کیا جاتا تھا۔ ان شعروں میں فارسی کے شعر بیشتر اور اردو کے کمتر ہوتے تھے۔ برسوں یہی معمول رہا۔ میر انیس دوسرے شعرا کا کلام سناتے رہتے تھے۔ مگر اپنے شعر کبھی نہ پڑھتے تھے۔

ان شبینہ صحبتوں میں شاہنامہ فردوسی کا ذکر اکثر ہوتا تھا۔ میر انیس کو شاہنامے کے اشعار بہت کثرت سے یاد تھے اور مصنّف شاہنامہ کو خدائے سخن کہا کرتے تھے اور مرزا دبیر بلا تامل (؟) ... ...

کرتے تھے اور مرزا رسیع باذل کو فردوسی کے قریب سمجھتے تھے۔

ایک مرتبہ میر حامد علی نے میر انیس کے سامنے یہ شعر پڑھا؎

روشن ہے اس طرح دلِ ویراں میں داغ ایک　　اجڑے نگر میں جیسے جلے ہے چراغ ایک[1]

میر صاحب لیٹے تھے۔ یہ شعر سن کر اٹھ بیٹھے، ایک اُف کی اور فرمایا کہ میں اب بڑھاپے میں ایسے شعروں کی تاب نہیں لاسکتا، اس سن میں ایسے تیر نہیں کھا سکتا۔ اس کے بعد حسبِ معمول اس شعر پر تبصرہ ہونے لگا۔ میر صاحب نے اس کی شرح کے سلسلے میں فرمایا کہ پرانے زمانے میں جب کسی بستی پر عتاب شاہی نازل ہوتا تھا تو وہ بستی ویران کردی جاتی تھی اور اس میں کسی نمایاں مقام پر ایک چراغ جلا دیا جاتا تھا ظاہر ہے کہ اس قدیم دستور پر نظر رکھنے سے اس شعر کا اثر بہت بڑھ جاتا ہے۔

میر انیس اکثر کہا کرتے تھے کہ "افسوس ہے جو دل میں ہوتا ہے وہ پورے طور پر قلم سے

---

[1] تذکرۂ عشقی میں اصالت خاں ثابت عظیم آبادی کا ایک شعر یوں لکھا گیا ہے؎

روشن ہے میرے سینۂ سوزاں میں داغ ایک　　تاریک گھر میں جلتا ہو جیسے چراغ ایک

(تذکرۂ عشقی مطبوعہ ص ۱۱۳)

ادا نہیں ہوتا، جیسا کہنا چاہتا ہوں ویسا نہیں ہوتا۔ میر حامد علی کہتے تھے کہ آپ کا کلام اس پائے کا تو ہوتا ہے، اب اس سے بہتر اور کیا ہوتا؟ مگر میر انیس پھر بھی فرماتے تھے کہ "اس کو میرا دل ہی جانتا ہے کہ جو کچھ میں کہنا چاہتا ہوں وہ ٹھیک طور پر ادا نہیں ہوتا۔" آخر عمر میں میر حامد علی میر انیس کے اس قول کی تصدیق کرتے تھے اور مرثیوں کے بعض ایسے مقامات پڑھتے تھے، جہاں پر میر انیس نے ایک ہی بات دو طرح سے بیان کی، لیکن دوسرا طرز ادا پہلے سے بدرجہا بہتر تھا۔ مثلاً یہ دو مصرعے بھی پڑھا کرتے تھے ع "میری قبا پہ اکبر مہ رو کا ہے لہو"، "تر تھا جواں پسر کے لہو سے لباس سب یہ"

گرمی کی شدت کے بیان میں میر انیس کا یہ بند بہت شہرت رکھتا ہے ؎

آب رواں سے منھ نہ اٹھاتے تھے جانور   جنگل میں چھپتے پھرتے تھے طائر ادھر ادھر
مردم تھے سات پردوں کے اندر عرق میں تر   خس خانۂ مژہ سے نکلتی نہ تھی نظر
گر چشم سے نکل کے ٹھہر جائے راہ میں
پڑ جائیں لاکھ آبلے پائے نگاہ میں[1]

مگر میر حامد علی کا قول تھا کہ یہ انیسی رنگ نہیں ہے۔ ایسا مبالغہ انیس سے کم درجے کے شاعر بھی کر سکتے ہیں۔ اس کے بعد گرمی کے بیان میں انیس کا وہ بند پڑھتے تھے جس کے قافیے بڑی دھوپ، کڑی دھوپ وغیرہ تھے اور ایک مصرع یہ تھا ع

یاں تین پہر چاند پہ زہرا کے پڑی دھوپ

اور کہتے تھے کہ یہ انیس کا مخصوص رنگ ہے جو کسی اور کے حصے میں نہیں آیا۔

---

[1] میر انیس نے اس مقام پر گرمی کی شدت کا بیان آٹھ بندوں میں لکھا ہے۔ راقم نے اپنی کتاب شاہکار انیس میں ان بندوں کے شاعرانہ محاسن بیان کرنے کے بعد لکھا ہے کہ یہ انیس کا خاص رنگ نہیں ہے اور ان کے رنگ کی مثال میں یہ بند پیش کیا ہے ؎

وہ گرمیوں کے دن وہ پہاڑوں کی راہ سخت   پانی نہ منزلوں کہیں، نہ سایۂ درخت
ڈوبے ہوئے پسینے میں ہیں غازیوں کے رخت   سنولا گئے ہیں رنگ جوانان نیک بخت
واکب جائیں چاند سے چہروں پہ ڈالے ہیں
تونسے ہوئے سمند زبانیں نکالے ہیں

میر انیس مرثیہ گوئی کی طرح مرثیہ خوانی میں بھی بے نظیر تھے۔ ان کا پڑھنا سن کر لوگ مسحور ہو جاتے تھے، جیسا کہ ذیل کے واقعے سے ظاہر ہوگا :

میر حامد علی کی کچھ آبائی جائداد آرہ ضلع شاہ آباد میں تھی۔ اس لیے وہ کبھی کبھی وہاں جایا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ وہیں غالباً صفیر بلگرامی نے ان سے بیان کیا کہ میں کلامِ دبیر کا شیدائی تھا، انیس کے کمال کا قائل نہ تھا۔ ایک مرتبہ اتفاقاً انیس کی ایک مجلس میں شرکت ہوئی اور میں بے دلی سے ان کو سننے لگا۔ لیکن دوسرے ہی بند کی مندرجۂ ذیل بیت ؎

ساتوں جہنم آتشِ فرقت میں جلتے ہیں
شعلے تری تلاش میں باہر نکلتے ہیں[1]

انھوں نے اس انداز سے پڑھی کہ مجھے شعلے بھڑکتے ہوئے دکھائی دینے لگے اور میں ان کا پڑھنا سننے میں ایسا محو ہوا کہ اپنے تن بدن کا ہوش نہ رہا۔ یہاں تک کہ جب ایک دوسرے شخص نے مجھے ہوشیار کیا تو مجھے معلوم ہوا کہ میں کہاں ہوں اور کس عالم میں ہوں۔

میر انیس نہایت خوش گفتار تھے۔ جب کسی صحبت میں وہ گفتگو کرنے لگتے تھے تو کوئی شخص کسی دوسری طرف متوجہ نہیں ہو سکتا تھا۔ میر حامد علی کی شادی کے انتظام میں میر انیس بھی شریک تھے۔ جب دسترخوان بچھا اور لوگ کھانا کھانے بیٹھے تو میر صاحب نے بعض بہت باتکلف مہمانوں کے پاس جا کر ان کو اپنی باتوں میں ایسا محو کر لیا کہ وہ اپنا تکلف بھول گئے اور زیادہ کھانا کھا گئے، جس کا خود ان لوگوں نے اعتراف کیا۔

میر انیس اپنے چھوٹے بھائی مونس اور بڑے بیٹے نفیس کو مرثیہ گوئی کی مشق اس طرح کرواتے تھے کہ ایک ٹیپ کہہ کر ان کو دے دیتے تھے اور کہتے تھے "اس پر مصرعے لگاؤ۔" وہ

---

[1] یہ بیت میر انیس کے اُس مرثیے میں ہے جس کا مطلع ہے "جب لشکرِ خدا کا علم سرنگوں ہوا" پورا بند حسب ذیل ہے۔ حضرت علی اکبر شام کے ایک نامی پہلوان سے فرماتے ہیں ؎

غزہ ہیں نہیں، تجھے دعوا ہے گر تو آ   تیری طرف یزید، ہماری طرف خدا
آمد تو دیکھی، جنگ کے بھی کچھ ہنر دکھا   مالک تجھے سقر میں بلاتا ہے، جلد جا

ساتوں جہنم آتشِ فرقت میں جلتے ہیں
شعلے تری تلاش میں باہر نکلتے ہیں

مصرعے لگا کر سناتے تھے۔ میر انیس ان کا عیب و ہنر بیان کرتے تھے اور ان سے بہتر مصرعے کہنے کا حکم دیتے تھے۔ پھر ان مصرعوں پر تنقید کرتے تھے۔ اسی طرح ایک ہی ٹیپ پر کئی کئی مرتبہ مصرعے لگواتے تھے اور آخر میں خود مصرعے لگاتے تھے۔ میر مونس نے ایک مرتبہ یہ مصرع کہا تھا ع

ہر برگ بسانِ دلِ مجروح تپاں تھا

میر انیس نے اس کو یوں بنا دیا ع

ہر برگ بہ رنگِ دلِ مسموم تپاں تھا

میر امجد حسین شاگرد میر مونس نے اپنے استاد کے حوالے سے بیان کیا کہ نواب میر محمد حسین کے یہاں ایک نہایت مشہور سالانہ مجلس کے لیے مرثیہ کہہ کر میر مونس میر انیس کے پاس اصلاح کے لیے گئے۔ اتفاق سے میر صاحب اس وقت حوض میں نہا رہے تھے۔ اسی حالت میں وہ مرثیہ لے لیا اور چند بند دیکھ کر اسے حوض میں ڈبو دیا اور ناپسندیدگی کے کچھ الفاظ کہے۔ میر مونس نے دست بستہ عرض کیا کہ "بجا ارشاد ہوا" مگر چونکہ مجلس میں صرف تین دن باقی تھے اس لیے ان کو بہت افسوس ہوا کہ اب حسب معمول نیا مرثیہ نہ پڑھ سکوں گا۔ دوسرے دن میر انیس نے پورا مرثیہ کہہ کر ان کو دے دیا اور میر مونس نے وہی مرثیہ اس مجلس میں پڑھا۔

میر حامد علی کے فرزند نواب مولوی سید مہدی حسن رضوی نے اپنے والد سے میر انیس کی غزلوں کے بہت سے اشعار سنے تھے۔ ان میں سے صرف ایک شعر ان کو یاد رہ گیا ہے

پہلے سے ہلال جھک گیا ہے آمد آمد کمال کی ہے

انھوں نے میر انیس کی غزل کا حسب ذیل مطلع میر امجد حسین شاگرد میر مونس سے سنا تھا ۔

چمن کے افشاں نظر اس مرنے جو کی تارو ں سے آسماں رات کو لوٹا کیا انگاروں پر

میر انیس اپنے اوقات کے بہت پابند تھے۔ ایک مرتبہ میر مونس بیمار ہوئے۔ میر حامد علی ان کی عیادت کو گئے۔ شیش محل کے امیر با توقیر نواب امجد علی خاں صاحب بھی اس وقت اسی غرض سے آئے ہوئے تھے۔ بارہ بجے دن کا وقت تھا۔ میر حامد علی نے چاہا کہ میر انیس سے بھی ملاقات کریں، مگر میر مونس نے کہا کہ یہ وقت میر صاحب

کے ملنے کا نہیں ہے۔ میں ان کو آپ کی تشریف آوری کی اطلاع نہیں دے سکتا۔
میر حامد علی نے میر صاحب سے اپنی بے تکلفی پر اعتماد کرکے اپنی ذمہ داری پر اطلاع کروائی مگر میر انیس نے اس وقت ملاقات نہیں کی۔ میر حامد علی کو یہ بات ناگوار ہوئی اور انھوں نے اس دن سے میر صاحب کے یہاں رات کو جانا ترک کر دیا۔ چند روز کے بعد میر انیس اسی وقت یعنی بارہ بجے دن کو میر حامد علی کے یہاں خود آئے اور ملاقات کا وہی وقت ہمیشہ کے لیے مقرر کر دیا۔ جب گرمی کا موسم آیا تو یہ وقت ملاقات کے لیے نہایت تکلیف دہ ثابت ہوا۔ میر صاحب نے فرمایا کہ میں نے رات کا وقت تمھاری ہی آسانی کے خیال سے مقرر کیا تھا۔ اب وہ مصلحت خود تمھاری سمجھ میں آگئی ہوگی۔ اس پر میر حامد علی نے اپنی غلطی کی معذرت کی اور معافی مانگی اور پھر حسب معمول قدیم رات کے وقت جانے لگے۔
میر حامد علی کو میر انیس کے انتقال کا اس قدر صدمہ ہوا کہ انھوں نے باہر بیٹھنا ترک کر دیا اور زیادہ تر خانہ نشین رہنے لگے۔ میر انیس کے انتقال کے بہت دن بعد وہ لکھنؤ کے نامی مجتہد شمس العلماء مولانا سید ناصر حسین صاحب قبلہ کی خدمت میں اکثر جایا کرتے تھے۔ قبلہ و کعبہ کا شباب کا زمانہ تھا اور مرزا دبیر کا کلام پسند خاطر تھا۔ اکثر میر انیس کے کلام پر ایراد فرمایا کرتے تھے اور میر حامد علی ہر اعتراض کا جواب دیتے تھے اور جواب کے ساتھ یہ بھی ضرور کہتے تھے کہ میر انیس سے غلطی ہو ہی نہیں سکتی۔
اپنی علمی استعداد اور سلامت ذوق اور برسوں روزانہ کئی گھنٹے میر انیس کی صحبت کے باوجود میر حامد علی آخر عمر میں کہتے تھے کہ اب میں کلام انیس کو کچھ کچھ سمجھنے لگا ہوں۔ انیس کے کلام میں وہ باریکیاں ہیں جن تک نظر پہنچنا بہت مشکل ہے۔
میر حامد علی کا بیان تھا کہ شیش محل کے دولت مند نواب امجد علی خاں میر انیس کے ساتھ کچھ سلوک کرتے رہتے تھے مگر اس طرح کہ میر صاحب سے مل کر جب واپس جانے لگتے تھے تو ان کی محل سرا کے دروازے پر اندر سے کسی خادمہ کو بلوا کر رومال میں بندھی ہوئی اشرفیاں اس کو دیتے تھے اور کہتے تھے "یہ رومال کسی ایسی جگہ ڈال دینا کہ بیگم صاحب کی نظر اس پر پڑ جائے۔ یہ نہ کہنا کہ کون دے گیا ہے۔"

میر انیس کے دو استاد

دنیا کی اکثر عظیم شخصیتوں کی طرح میر انیس کے بھی بچپن کے حالات معلوم نہیں ہیں۔ ان کی تعلیم و تربیت کا برائے نام ذکر جو ان کے سوانح نگاروں نے کیا ہے، وہ بھی اعتبار کے قابل نہیں ہے۔ امجد علی اشہری نے صرف اتنا لکھا ہے:

"میر انیس کی ابتدائی تعلیم فیض آباد میں ہوئی۔ جب لکھنؤ تشریف لائے تو یہاں اپنی پرائیوٹ تعلیم کو جاری رکھا اور چالیس برس کی عمر میں مطالعۂ کتب سے بے نیاز ہو گئے[1]۔"

یعنی چالیس برس کی عمر کے بعد میر انیس کو کسی کتاب کے مطالعے کی ضرورت نہیں رہی۔ مطالعۂ کتب کے لیے عمر کی ایک حد مقرر کر دینا محض قیاس پر مبنی معلوم ہوتا ہے۔ احسن لکھنوی کا بیان ہے:

"میر انیس نے درسیات کی ابتدائی کتابیں قبلہ و کعبہ میر نجف علی صاحب سے فیض آباد میں پڑھی ہیں اور لکھنؤ پہنچ کر مولوی حیدر علی صاحب سے عربی کی تکمیل کی[2]۔"

اسی کے ساتھ وہ یہ بھی کہتے ہیں:

"میر صاحب جب لکھنؤ تشریف لائے تو صاحب اولاد تھے۔ میر نفیس مرحوم اور ان کی دو بہنوں کی پیدائش فیض آباد میں ہوئی ہے[3]۔"

یعنی میر انیس لکھنؤ پہنچنے کے وقت تین بچوں کے باپ ہو چکے تھے، مگر صرف ابتدائی درسی کتابیں پڑھے ہوئے تھے۔ لکھنؤ پہنچ کر انھوں نے مولوی حیدر علی سے عربی کی تکمیل کی، جس میں کئی برس لگے ہوں گے۔ یہ بیان صحت سے بہت دور ہے۔ "قبلہ و کعبہ میر نجف علی صاحب" ملائے مکتبی تو تھے نہیں کہ کسی بچے کو کریما، مقیماں اور میزان و منشعب

---

[1] حیات انیس ص ۱۹ [2] واقعات انیس ص ۳۸ [3] واقعات انیس ص ۱۲

پڑھاتے۔ وہ ایک جید عالم تھے۔ میر انیس کے بڑے چچا میر احسن خلق نے طب کی بڑی بڑی عربی کتابیں دوسرے نامی استادوں سے پڑھنے کے بعد طب کی آخری کتاب قانون شیخ مولوی میر نجف علی ہی سے تین سال پڑھی تھی۔ بہت ممکن ہے کہ میر خلق کے منجھلے بھائی اور میر انیس کے والد میر خلیق بھی ان کی تعلیم سے مستفیض ہوئے ہوں۔ میر انیس نے کافی تعلیم حاصل کرنے کے بعد مولوی میر نجف علی سے اس کی تکمیل کی ہوگی۔

احسن نے مولوی حیدر علی کا تعارف ان لفظوں میں کیا ہے:

"مولوی حیدر علی صاحب عالم جید لکھنؤ میں تھے۔ ان کے نام سے ایک مسجد محلہ کرہ حیدر حسین خاں لکھنؤ میں اب تک موجود ہے[1]"

یہاں احسن نے نام سے دھوکا کھایا ہے۔ میر انیس کے استاد وہ حیدر علی نہیں تھے، جو لکھنؤ کے رہنے والے شیعہ عالم تھے اور جن کے نام سے ایک مسجد لکھنؤ میں اب تک موجود ہے، بلکہ یہ وہ مولوی حیدر علی ہیں جو فیض آباد میں رہتے تھے اور سنی عالم تھے۔ آزاد لکھتے ہیں:

"مولوی حیدر علی صاحب منتہی الکلام انھیں کے محلے میں رہتے تھے اور پڑھایا کرتے تھے، میر انیس فرماتے تھے کہ ابتدائی کتابیں میں نے انھیں سے پڑھی تھیں[2]"

امیر احمد علوی نے دو تین لفظوں کا اضافہ کر کے احسن کے بیان کو دہرا دیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"درسیات کی ابتدائی کتابیں میر نجف علی سے پڑھیں، جو اس وقت فیض آباد میں فاضل متند تھے۔ عربی کی تکمیل لکھنؤ میں علامۂ عصر مولوی حیدر علی سے کی[3]"

اس بیان میں "فاضل متند" اور "علامۂ عصر" کے الفاظ علوی صاحب کے طبع زاد ہیں۔

شعر کے فن میں میر انیس کے کسی استاد کا نام نہیں ملتا۔ لیکن ظاہر ہے کہ دو نامی شاعر یعنی ان کے چچا میر خلق اور والد میر خلیق گھر ہی میں موجود تھے۔ کسی بیرونی استاد کی تعلیم کی محتاجی نہ تھی، مگر جس طرح میر حسن نے، جو خود بلند پایہ شاعر تھے، اپنے بیٹے خلیق کے کلام کی اصلاح میاں مصحفی سے متعلق کر دی تھی (انھوں نے اپنا تذکرۂ ہندی اپنے اسی شاگرد کی فرمائش پر لکھا تھا) اسی طرح ممکن ہے کہ میر خلیق نے بھی انیس کے کلام

---

[1] واقعات انیس ص۳۰ (حاشیہ ۲)، [2] آب حیات ص۵۲۲ (حاشیہ)، [3] یادگار انیس ص۶۱

کی اصلاح اس زمانے کے کسی دوسرے استاد کے سپرد کردی ہو، مگر ہمیں اس کا علم نہیں۔

میر انیس کے جن دو استادوں کے نام ہم تک پہنچے ہیں، ان کے حالات اب تک سامنے نہیں آئے ہیں۔ مجھے مدت کی تلاش و تحقیق کے نتیجے میں، ان دو بزرگوں کے بارے میں جو کچھ معلوم ہوا ہے، وہ ذیل میں درج کیا جاتا ہے:

مولوی میر نجف علی فیض آبادی کے دادا مینے سے کشمیر میں آئے تھے۔ اس بنا پر وہ بھی کشمیری کہے جاتے تھے۔ 'تاریخ جہاں نما' کے مصنف ۱۲۲۲ھ میں لکھتے ہیں کہ اس وقت فیض آباد میں سب سے بڑے عالم میر نجف علی صاحب ہیں۔ غایت زہد و ورع و تقدس سے حاسدین ان کو تصوف سے متہم کرتے ہیں۔ اس معاملے میں ان سے اور غفران مآب مولوی سید دلدار علی صاحب سے جو خط کتابت ہوئی، اس میں انھوں نے مسلکِ تصوف سے انکار کیا ہے، پوری مراسلت 'آئینۂ حق نما' میں موجود ہے۔[1]

سبیکۃ الذہب میں مولوی نجف علی فیض آبادی کا حال یوں بیان کیا گیا ہے:

"وکَانَ فِی عَہْدِ شُجَاعِ الدَّوْلَۃِ فِی فیضْ آبَادَ مِنَ الحُکَمَاءِ الاَمْجَادِ الحُذَّاقِ الاَنْجَادِ نوّاب معالج خانِ الکشمیری مِنْ اَطِبّاءِ سُلطانِ مُحَمَّد شَاہِ الماوِ مِنَ العُلَمَاءِ المُتَاَلِّہِیْنَ السیّد نجف علیٌّ الکشمیریُ وَکَانَ عَابِدًا کَامِلًا زَاہِدًا تَارِکًا لِلدُّنْیَا الدَّنِیَّۃِ وَلَہٗ حَالَاتٌ وَ مَقَامَاتٌ وَمُکَاشِفَاتٌ وَکَرَامَاتٌ وَکَانَ غِذَائُہُ الخُبْزُ الیَابِسَ مَعَ المِلْحِ الجَرِیْشِ وَفَرَاشُہُ الحَصِیْرُ العَتِیْقُ بِجَنْبِہٖ الفَرِیْش کَانَ ذَاتَ یَومٍ فِی الحَمَّامِ اِذْ دَخَلَ فِیْہِ اَحَدٌ مِّنَ الاَعْلَامِ فَظَنَّ اَنَّہٗ الدَّلَّاکُ فَقَالَ لَہٗ اُدْلُکْ وَدَلِّکْنِی یَا اَیُّہَا الدَّلَّاکُ فَقَامَ وَغَسَّلَ وَدَلَّکَہٗ وَتَکَامَدَ بِکَ اِضْطَرَابَ نَفْسَہٗ فَاَعْطَاہُ اُجْرَۃً جَزِیْلَۃً فَرَدَّ وَقَالَ اِنْ اَجْرِیَ اِلَّا عَلَی اللّٰہِ وَلَمَّا فَرَغَ فَرَاحَ وَنَقَلَ الحِکَایَۃَ لِبَعْضِ

---

[1] تذکرۂ بے بہا فی تاریخ العلما ص ۳۱۲

أخِلّائه مِن أهلِ الصَّلاح فاستفسر منه حليته فصك
رأسه وقال هو ليس الدلاك بل هو خير من سكان الأفلاك
فقام وجاء إلى كتبه استعفاء لذنبه من هتك الحترامه
وخرّ المذلوك على قدميه فرفعه إليه وعانقه رجقويه و
قال لا بأس عليك يا أخا أتهدّدني إني أتوسّل إلى الله بخدمة
المؤمنين ليغفر لي خطيئتي[1]

اس عبارت کا خلاصہ یہ ہے کہ شجاع الدولہ کے عہد میں فیض آباد میں سید نجف علی کشمیری خدا پرست، فلسفی، عالم، عامل، زاہد، تارک الدنیا، صاحب کشف و کرامات تھے۔ نمک کے ساتھ سوکھی روٹی ان کی غذا اور ایک پرانی چٹائی ان کا بستر تھی۔ ایک دن آپ حمام میں تھے کہ ایک نامی شخص آیا اور آپ کو حمامی سمجھ کر بدن ملنے کو کہا۔ آپ نے خوب مل مل کر اس کو نہلایا۔ اس نے خوش ہو کر زیادہ اجرت دی، تو آپ نے واپس کر دی اور کہا کہ میری اجرت دینے والا تو بس اللہ ہے۔ اس نے یہ واقعہ اپنے دوستوں سے بیان کیا تو انھوں نے بتایا کہ وہ حمامی نہیں ہیں، بلکہ فرشتوں سے بڑھ کر ہیں۔ وہ شخص آپ کی جائے قیام پر آکر آپ کے قدموں پر گر پڑا اور معافی مانگی۔ آپ نے اس کو اٹھا کر گلے لگا لیا، تسلی دی اور کہا کہ میں مومنوں کی خدمت کو اپنی مغفرت کا وسیلہ سمجھتا ہوں۔

تاریخ نو میں مولوی نجف علی فیض آبادی کے بارے میں لکھا ہے:

"واضح باد کہ مولوی سید نجف علی از فضلائے عالی مقدار شیعہ، اکابر روزگار امامیہ بودہ۔ در تدریس و تعلیم کتب درسیہ و علم قرأت بے مثل ولاثانی بودند۔ در ۱۲۵۲ھ لبیک اجابت بہ داعی حق گفتند۔ چنانچہ ازیں مصراع موقعہ سید علی اوسط رشک ہویداست۔ ع

اے ہے سید نجف علی فاضل[2]

میر احسن خلق نے میر نجف علی سے تین برس 'قانون شیخ' کا درس لیا تھا۔ میر نجف

---

[1] سبیکۃ الذہب ص۵۹ (مطبع اثناعشری، لکھنؤ۔ ۱۳۰۹ھ) [2] تاریخ نو ص۶۳۔

ان کے حالات کے لیے ان سے زیادہ معتبر راوی اور کون ہو سکتا ہے۔ وہ اپنی کتاب
'طب احسن' کے دیباچے میں لکھتے ہیں:

"جناب میر نجف علی صاحب کہ در علم طب و حکمت و فقہ یکتائے زمان و در ماد صادق ابوذر و سلمان کہ زبانِ خامہ رطب اللسان سراپا معجز بیان، بہ عبادت الٰہی شب بیدار، بندۂ خاصِ پروردگار، معروف جود و سخا، در دعائے خلائق رتبۂ ملاء، شاعر و نثار و دبیر، مقبول در تحریر و تقریر، مجمعِ علوم خلقش بالعموم، سینۂ ایشاں مخزنِ اسرارِ بے اندازہ، بے دست دعائیش درِ اجابت کشادہ[1]"

تذکرۂ خوش معرکۂ زیبا سے معلوم ہوتا ہے کہ مولوی نجف علی کے صاحبزادے میر علی احمد شاعر تھے، رسا تخلص تھا، میر علی اوسط رشک کے شاگرد تھے۔ ان کے ذکر میں ان کے والد کا نام تعظیمی الفاظ کے ساتھ یوں لکھا گیا ہے: "مولانا و سیدنا جناب غفران مآب میر نجف علی صاحب طاب ثراہ[2]"

تذکرۂ سراپا سخن میں بھی میر علی احمد رسا کو میر نجف علی مجتہد کا بیٹا، میر علی اوسط رشک کا شاگرد اور صاحبِ دیوان لکھا ہے۔

مولوی میر نجف علی علوم اسلامی کے جیّد عالم ہونے کے علاوہ علم طب کے بھی بہت بڑے ماہر تھے، شاعر تھے، صاحبِ تصانیف تھے۔ ان کی تصنیفوں کے بارے میں جو کچھ معلوم ہو سکا ہے، وہ مختصر پیش کیا جاتا ہے۔ درس و تدریس ان کا خاص مشغلہ تھا۔ ان کی تصنیفوں میں متعدد رسالے ہیں جو درسی ضرورتوں کے تحت لکھے گئے ہیں۔

تصنیفات مولوی میر نجف علی

ایک قلمی مجموعہ[3] میں نے دیکھا ہے، جس میں مندرجۂ ذیل چیزیں مولوی میر نجف علی کی تصنیف سے ہیں:

---

[1] طب احسن (قلمی)، [2] تذکرۂ خوش معرکۂ زیبا (قلمی)، [3] یہ مجموعہ مولوی بدر الحسن صاحب کی ملک ہے اور انھیں کی عنایت سے مجھے اس کے مطالعے کا موقع ملا۔ موصوف بنارس ہندو یونیورسٹی میں شعبۂ فارسی و عربی کے صدر ہیں۔ ادیب

۱ تا ۱۱۔ مختلف ناموں سے گیارہ رسالے عربی صرف و نحو کے بعض مسائل کے بیان میں۔ ۱۲ تا ۱۷ چھ رسالے مختلف علوم میں یعنی ایک ایک رسالہ منطق، ہیئت، حساب، مناظرہ، عروض اور تجوید کے باب میں۔

یہ سترہ رسالے فارسی زبان میں ہیں اور بہت مختصر ہیں۔ ان کی مجموعی ضخامت ۱۴۶ صفحے ہیں۔

۱۸۔ رسالہ اعتقادیہ (عربی)، ضخامت ۲۴ صفحے۔

۱۹۔ شرح بہادریہ (عربی)، ضخامت ۹۶ صفحے۔

۲۰۔ شرح جواہر الاصول (فارسی)، علم کلام میں، ضخامت ۲۳۰ صفحے۔

(یہ سب چیزیں پختہ اور جلی خط میں ایک ہی کاتب کی لکھی ہوئی ہیں)

۲۱۔ مثنوی نظم الجواہر (فارسی) ضخامت ۱۱۴ صفحات

۲۲۔ ایک مختصر رسالہ مخارج و صفاتِ حروفِ تہجی میں۔ یہ کسی دوسرے شخص کے قلم کا لکھا ہوا ہے اور اس کا خط اچھا نہیں ہے۔ علمِ مخارجِ حروف میں مولوی میر نجف علی کے رسالے کا ایک نسخہ میرے کتاب خانے میں بھی ہے، جس کا ترقیمہ حسب ذیل ہے:

"تمام شد رسالہ در علم مخارجِ حروف من تالیفِ مولانا و مقتدانا اعنی استاذی جناب مولوی سید نجف علی صاحب فیض آبادی دام ظلہم بتاریخ غرہ ماہ ذی حجہ ۱۲۵۲ ہجری بمقام بلدۂ مذکور"

"شرح بہادریہ" کے مختصر دیباچے سے معلوم ہوتا ہے کہ مولوی نجف علی نے دلیرالدولہ دلاور الملک نواب محمد علی خان بہادر معروف بہ مرزا حیدر کے فرزند محمد ذکی خان مشہور بہ نواب بہادر کے لیے مشکلاتِ بہادریہ کی شرح لکھی تھی، جسے ان کے انتقال کے بعد ان کے شاگرد شیخ منور علی نے مرتب کر کے اس کا نام فوائد المنطقیہ رکھا۔ اس دیباچے سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ مولوی نجف علی حج اور زیارات سے مشرف ہو چکے تھے۔

اس مجموعے کے آخر میں مخارجِ حروف میں جو رسالہ ہے، اس پر یہ الفاظ لکھے ہوئے ہیں: "حسب فرمایش جناب محمد علی خان صاحب" یہ محمد علی خان غالباً وہی ہیں جن کا خطاب دلیرالدولہ دلاور الملک اور عرف مرزا حیدر تھا۔

اس مجموعے میں مولوی نجف علی کی ایک فارسی مثنوی بھی ہے جس میں ۱۶۷۵ شعر ہیں۔ اس میں یوذاسف کا قصہ بیان کیا گیا ہے۔ ابتدا ان شعروں سے کی گئی ہے ؎

اے منزہ ذاتت از تعریف ما　　وَے مبرا صفت از توصیف ما
در نیاید در تصور ذات تو　　کَے شود از جنس و فصل اثبات تو
بہر اثباتت سزد عین شہود　　زانکہ ذاتت آمدہ عین وجود

حمد و نعت کے بعد قصہ یوں شروع ہوتا ہے ؎

بُد شہے در کشور ہندوستاں　　باج خواہ و تاج بخشِ خسرواں،

مثنوی کے آخری حصے کا عنوان یہ ہے:

"در تعریفِ نواب ناظر جواہر علی خاں بہادر دام اقبالہٗ"

اس عنوان کے تحت سترہ شعر جواہر علی خاں کی مدح میں ہیں۔ چند شعر نقل کیے جاتے ہیں ؎

می دہد نواب ناظر در جہاں　　دین و دنیایش نشان زندگاں
دین و دنیا گشتہ با ذاتش قریں　　وصفش آمد صاحبِ دنیا و دیں
بس کہ شد بر ہمگناں امداد اُو　　گشت فیض آباد فیض آباد اُو
کار اُو داد و دہش، صوم و صلوٰۃ　　شغل مسنونات، اداے واجبات
خلق با خلق و خضوعش با خدا　　مرجع خلق و رجوعش با خدا

اس کے بعد کہتے ہیں کہ میرے ہم صحبت سب اہل کمال ہیں۔ ان میں صرف ایک میں بے کمال ہوں۔ پھر اپنا ذکر ایک شخص غائب کی طرح یوں کرتے ہیں ؎

بہرہ اش دارستہ از فضل و ہنر　　بُردہ در بیہودگی چندے بسر
چند بیتِ مثنوی بودش بہ یاد　　خواست تا گوید بداں سان طبع زاد
رفتہ رفتہ رفت تا این جا سخن　　ورنہ شعر و شاعری اُو را نہ فن
گشت چوں در نعمتِ منعم تمام　　ساختش بر مدحِ منعم اختتام
شکرِ منعم بود واجب گر دو گفت　　شکرِ منعم را نہ بایستے نہفت
گشت چون در دو لتش اتمام اُو　　ساختش نظم الجواھر نام اُو

مندرجہ بالا اشعار میں دوسرا شعر قابل غور ہے، جس میں کہا گیا ہے کہ مجھے مثنوی کے چند

شعر یاد تھے، جی چاہا کہ میں بھی اسی طرح کی ایک طبع زاد مثنوی کہوں۔ مثنوی کا نام نہیں بتایا گیا ہے، لیکن قرینے سے قیاس ہوتا ہے کہ یہاں مولوی روم کی بے نام مثنوی مراد ہے، اس لیے کہ اسی مثنوی کی بحر اختیار کی گئی ہے اور اسی کی طرح نقلیں اور تمثیلی حکایتیں بہت بیان کی گئی ہیں۔

آخری تین شعروں میں جواہر علی خاں کو 'منعم' قرار دیا گیا ہے، ان کا شکریہ ادا کیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ انھیں کے نام پر مثنوی کا نام نظم الجواھر رکھا گیا ہے۔

مولوی نجف علی کہتے ہیں کہ شعر و شاعری میرا فن نہیں ہے لیکن یہ صرف ان کا انکسار ہے۔ مجھے ایک قدیم بیاض میں ان کے تین فارسی قصیدے ملے ہیں۔ ایک قصیدہ ۳۶ شعر کا ہے، جس کا عنوان ہے "قصیدۂ میر نجف علی صاحب فیض آبادی در مدح جناب امیر المومنین علی ابن ابی طالب علیہ السلام" دوسرے قصیدے میں ۲۹ شعر ہیں اور اس کا عنوان ہے "قصیدہ در مدح جناب سید الشہدا" تیسرا قصیدہ ۲۲ شعر کا ہے۔ اس کا عنوان کچھ نہیں ہے۔ ہر قصیدے کے مقطع میں لفظِ نجف موجود ہے، اگرچہ وہ تخلص کے طور پر نہیں لایا گیا ہے۔ ہر قصیدے کے آخر میں کاتب نے اپنا نام یوں لکھا ہے: "راقم الحروف بندہ احمد علی عفی عنہ۔ ۱۲۵۰ ہجری" ذیل میں ان تینوں قصیدوں سے چند شعر نقل کیے جاتے ہیں ؎

(۱)

اے فضلِ حق بذاتِ تو گردیدہ مستمند — شان و نشانِ احمدی از نامِ تو بلند

ہر جا کہ نقشِ پاے تو رفعت و ہر بہ خاک — کرّوبیاں جبیں پے تعظیم می نہند

قربانِ لطفِ تو کہ نہادی قدم بخاک — از بہرِ دست گیریِ چندیں نیازمند

ورنہ غبارِ طبع کجا، نورِ حق کجا — اے قدرِ ذاتِ پاکِ تو، بیروں زچون و چند

شاہا! من آں غلامِ توام کز عطاے تو — دارم و لے کہ قلزمِ عمّاں از و چکند

ہم نامی و مقامِ توام دادہ آں مقام — کیں طلیتم بہ نظمِ تو دُرِّ نجف فگند

(۲)

دلم از برقِ الم جلوہ گہہ عمرانی — نَورقِ چشم ز سیلابِ ستم طوفانی

از گریباں بزنم تا سرِ داماں صد چاک — بکشم جادرِ خوں بر بدنِ عریانی

داغِ ماتم بہ جگر در فگند تابشِ مہر   ابرِ غم در صدفِ چشم کند نیسانی
چوں فسازم ہمہ ایں حال کہ در دشتِ بلا   کشتہ گردید سرِ مملکتِ ایمانی
مہرِ برجِ اسدی، ماہِ کنارِ زہرا   گلِ باغِ نبوی، درِ یمِ سبحانی
سجدہ گاہِ دو جہاں! خاکِ درت شد بہ نیاز   بہ نیازے کہ نہادی بہ زمیں پیشانی
برنہد خاکِ درت در دل بہ داغِ سجود   سجدہ از خاکِ درت جبہہ کند نورانی
ہمہ سرِ سرِ الٰہی، ہمہ رو جلوۂ طور   ہمہ جاں نورِ حقیقت، ہمہ تن روحانی
نورِ پیشانیت آئینۂ صاحب نظراں   خمِ ابروے تو محرابِ دلِ عرفانی
گیر دستم بہ جہاں، اے خلفِ شاہ نجف!   سازِ و سامان و کرم و زسر و سامانی

(کذا فی الاصل)

(۳)

بہ مژگاں سُفتم آں دُرہا کہ آورد ست نیسانش   بہ ابرِ غمش داماں و جیب و سینۂ عمانش
بہ دو دستِ پاکِ پیغمبر دو بالا رفعتِ حیدر   بہ تائیدِ یداللّٰہی مشید دین ز ارکانش
بہ آں علم و عمل رانی، دو عالم کرد نورانی   امیں، با آں ہمہ دانی، بود طفلِ دبستانش
خدا و ہمرا، بذاتِ خود بہ اسما و صفاتِ خود   بجز از کائناتِ خود، بہ اہلِ بیت و اخوانش
بکن سیراب در محشر ز دستِ ساقیِ کوثر   موافق سہل کن یکسر، بہ ہر یک از غلامانش
دگر زیں مجمع حاضر کہ شد نواب ما ناظر   بود شاہ نجف ناصر، بجسم و جانِ ایمانش

سبیکۃ الذہب کے مصنف نے لکھا ہے کہ مولوی نجف علی سوکھی روٹی، نمک کی کنکریوں کے ساتھ کھا لیتے تھے اور ایک چٹائی پر سو رہتے تھے۔ مگر خود ان کی تصنیفوں سے اس کی تصدیق نہیں ہوتی۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ انھوں نے ایک امیرِ کبیر دلیر الدولہ دلاور الملک نواب محمد علی خان بہادر معروف بہ مرزا حیدر کی فرمایش سے مخارجِ حروف سے متعلق ایک رسالہ لکھا۔ ان کے فرزند محمد زکی خان مشہور بہ نواب بہادر کے لیے مشکلاتِ بہادریہ کی شرح لکھی۔ نواب ناظر جواہر علی خان کے نام پر اپنی مثنوی کا نام نظم الجواہر رکھا۔ اس میں ایک عنوان قائم کیا "در تعریف نواب ناظر جواہر علی خان بہادر دام اقبالہٗ" اور سترہ شعر ان کی مدح میں کہے۔ مثنوی کے آخری حصے میں انھیں 'منعم' کہا اور 'مدحِ منعم' اور 'شکرِ منعم' پر اسے ختم کیا ہے۔ ایک

قصیدے کے آخری شعر میں نواب ناظر کی موجودگی کا ذکر کرکے ان کے جسم و جان و ایمان کے لیے دعا کی ہے۔ یہ روش ایسے شخص کی نہیں ہو سکتی جو سوکھی روٹی نمک کے ساتھ کھا لیا کرتا ہو اور ایک چٹائی پر پڑا رہتا ہو۔ غالباً اس سے مراد یہ ہے کہ وہ ایک درویش منش، تکلفات سے دور، تارک لذات اور متوکل بزرگ تھے۔ ان کی ان صفتوں کی تصدیق میر احسن خلق کے منقولۂ بالا بیانات سے بھی ہو جاتی ہے۔

میر انیس کے دوسرے استاد مولوی حیدر علی فیض آبادی ابن شیخ محمد حسن ابن شیخ محمد ذاکر ابن شیخ عبدالقادر دہلوی ایک حنفی عالم تھے۔ شیعوں سے مناظرہ اور ان کی رد ان کا خاص شغلہ تھا۔ تذکرۂ علماے ہند کے مصنف کا بیان ہے کہ وہ علم مناظرہ و کلام میں "فایق الاقران" تھے۔ خصوصاً شیعوں سے مناظرہ کرنے کے فن میں ہمارے زمانے میں ان کا کوئی نظیر نہ تھا۔ فریق مخالف کی کتابوں کا مطالعہ زیادہ تر مد نظر تھا۔ ان کی عمر چھہتر سے متجاوز ہو گئی تھی۔ قریب پانچ سال کے ہوئے کہ حیدر آباد دکن میں اُس دیار کے فرماں روا کے یہاں دو سو روپے ماہ دار کے ملازم ہو گئے اور وہیں انتقال کیا۔[1] شیعوں سے مناظرے کے موضوع پر ان کی کئی کتابیں ہیں۔ سب سے مشہور کتاب منتہی الکلام ہے۔ یہ کتاب مولوی سبحان علی خان کی ایک کتاب کا جواب ہے، جو انھوں نے ۱۲۴۰ھ میں تالیف کی تھی۔ منتہی الکلام کی تالیف میں ایک سال اور چند ماہ صرف ہوئے اور یہ ۱۲۵۱ھ میں تمام ہوئی اور غالباً اسی سال حسام الدولہ فقیر محمد خان کی فرمایش سے لکھنؤ میں چھپی۔ اس کے بعد ۱۲۵۲ھ میں دوسری مرتبہ چھپی۔ یہ دوسرا ایڈیشن میں نے دیکھا ہے۔ اس کے سرورق سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ایڈیشن میر ناصر علی کے اہتمام سے مطبع ناصری میں چھپا تھا۔ مگر 'خاتمۃ الطبع' میں لکھا ہے کہ میر فخر الدین کے اہتمام سے مطبع حکیم غلام رضا خان میں چھپا۔ واللہ اعلم۔ اس مطبوعہ نسخے کا حجم ۸۱۶ صفحے ہے۔ تقطیع ۲۲×۲۹ ہے۔ ہر صفحے میں ۲۰ سطریں ہیں۔ زبان فارسی ہے۔ اس کتاب کا ایک ایڈیشن مطبع نول کشور میں بھی چھپا ہے، جس کی ضخامت ۱۲ + ۵۴۱ صفحے ہے۔ ہر صفحے میں سات انچ لمبی ۲۳ سطریں ہیں۔ یہ ایڈیشن بھی میں

---

[1] تذکرۂ علماے ہند (رحمان علی) ص۵۵

نے دیکھا ہے۔

شیعوں کے خلاف مناظرے کی ایک اور کتاب مولوی حیدر علی کی تالیف ہے، جس کا نام ہے رسالۃ المکاتیب فی رویتہ الثعالب والغرابیب[1] اس کتاب کے دیباچے سے معلوم ہوتا ہے کہ مؤلف کتاب منتہی الکلام کے اجزا مرتب اور صاف کروا کے سبحان علی خان کے پاس بھیجتے رہتے تھے۔ سبحان علی خان نے منتہی الکلام کے سلسلے میں بعض خط ایک شخص مسمّی بہ نور الدین حسین اکبر آبادی کو لکھے تھے، جو بہ قول مؤلف حقیقتاً شیعہ تھا، مگر خود کو سنّی ظاہر کرتا تھا اور مؤلف سے مل کر شکوک و اوہام اہل تشیع کے جوابات پوچھتا رہتا تھا۔ یہ خطوط اتفاقاً مؤلف کے ہاتھ لگے، انھوں نے بہ احتیاط رکھ لیے۔ جب مجتہدِ عصر نے منتہی الکلام کے خلاف حاکم کوفہ یعنی لکھنؤ کے سامنے استغاثہ پیش کیا تو مؤلف راتوں رات سفر کرتا ہوا کان پور پہنچا اور یہ خطوط اور اپنے مسودات اپنے ساتھ پالکی پر رکھ کر لیتا گیا۔ وہاں سبحان علی خاں سے ملاقات اور مذاکرے ہوتے رہے۔ وہیں نور الدین حسین کا ایک خط بہ نام سبحان علی خان اس کے ہاتھ آیا۔ ان تمام خطوں کو مؤلف نے اس کتاب میں جمع کر دیا ہے اور ہر خط سے شیعوں کے خلاف کچھ نتائج نکالے ہیں۔ یہ کتاب مطبع شرف المطابع دہلی میں خود مؤلف کی تصحیح کے ساتھ ۱۲۶۰ھ میں چھپی تھی۔ اس کا حجم ۲۳۲ صفحے اور سائز ۲۶×۲۰ ہے، ہر صفحے میں ۱۱ سطریں ہیں، فارسی زبان ہے۔ یہ کتاب میرے کتاب خانے میں موجود ہے۔

میر علی اوسط رشک نے ۱۲۵۴ھ میں ایک بے نام کی مثنوی کہی تھی جو ۱۲۶۱ھ میں مطبع احمدی لکھنؤ میں چھپی۔ اس مثنوی میں مختلف طبقوں کے ایسے شخصوں کے نام نظم کیے گئے ہیں، جو مصنف کی نظر میں نفرت و لعنت کے قابل ہیں۔ اس میں خاتمے کے قریب حیدر علی فیض آبادی اور ان کے ہم مشرب سلامت اللہ کا ذکر ملتا ہے ؎

اک سلام اللہ ہے دیو رجیم ۔۔۔ اس لیے ہے تائے مصدر بعد میم
ہے بری شیطاں صفت اللہ سے ۔۔۔ سمجھو اس کا قرب منّت اللہ سے (سلامت اللہ)

---

[1] تذکرۂ علمائے ہند صفحہ ۵۵ کے مولف نے اس کتاب کا نام یوں لکھا ہے: رویتہ الثعالیب والغرابیب فی انشار المکاتیب، مگر یہ صحیح نہیں ہے۔

ایک فیض آباد کا حیدر علی — وہ خفی مردود ہے، مرتد جبلی
نام ایسا دشمنِ نامِ امام — جس طرح کافور ہو زنگی کا نام
طعنہ زن ہیں دونوں کے دونوں سخن — شیعیانِ حیدر کرار پر

اوپر یہ لکھا جاچکا ہے کہ مولوی حیدر علی شیعوں کی رد لکھا کرتے تھے۔ اس بنا پر شیعی نقطۂ نظر سے وہ اس بدگوئی اور سخت کلامی کا ہدف بنائے گئے اور اسی بنا پر سنی نقطۂ نظر سے وہ تعریف و تحسین کے مستحق قرار پائے۔ ان کی مذکورہ بالا کتاب رسالۃ المنتہٰی کے سرورق پر ان کا نام تعظیمی، تعریفی اور دعائیہ فقروں کے ساتھ یوں لکھا گیا ہے:

"الفاضل الکامل، زبدۃ الاماثل، فخر الافاضل، قدوۃ المحققین، امام المتکلمین، مولانا مولوی حیدر علی صاحب، لازالت ظلال عاطفتہٖ علیٰ رؤس المستفیضین۔"

اس عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ مولوی حیدر علی کا شمار اہلِ سنت کے زبردست علما میں تھا اور وہ علمِ کلام کے بڑے عالم سمجھے جاتے تھے۔

مولوی حیدر علی کے سالِ وفات میں اختلاف ہے۔ مولوی محمد سعید حسرت عظیم آبادی نے ان کی وفات پر دو قطعۂ تاریخ کہے جو یہاں درج کیے جاتے ہیں:

"قطعۂ تاریخ رحلت مولوی حیدر علی صاحب منتہی الکلام بہ شہر حیدر آباد"[1]

(۱)

بہشت بریں زدار فنا — رفت حیدر علیِ حق آگاہ
فاضل کاملِ حمیدہ صفات — عالمِ بے عدیلِ عالی جاہ
صاحبِ منتہی الکلام کہ داد — شیعیان را جوابِ خاطر خواہ
سالِ رحلت سروش گفت اے داد — "ناصرِ دین و مذہب، حق آگاہ"
(۱۲۹۳ھ)

(۲)

اہلِ سنت مولوی حیدر علی — دخلِ کامل داشت در علمِ کلام
کو در رحلت زیں جہانِ پُرفساد — جائے او شد روضۂ دار السلام
گفت حسرت سالِ تاریخ وفات — "شد بجنات العلیٰ وے را مقام" ۱۲۹۹ھ

---

[1] قسطاس البلاغہ صفحہ ۲۰۵۔ حسرت عظیم آبادی کی نظم و نثر کا مجموعہ (باقی حاشیہ ص ۹۰ پر)

ان قطعوں میں بھی مولوی حیدر علی کی تعریف میں یہی کہا گیا ہے کہ وہ شیعوں سے مناظرہ کیا کرتے تھے اور ان کو جواب خوب دیتے تھے۔ میر انیس ایسے استاد کے شاگرد رہے تھے۔ اس سے قیاس کیا جاسکتا ہے کہ مولوی حیدر علی شیعی مذہب کے مخالف تھے، لیکن یہ اختلاف شیعہ افراد سے ان کے تعلقات پر کچھ زیادہ اثر انداز نہ تھا۔

تذکرۂ علمائے ہند کے علاوہ ان کتابوں میں بھی مولوی حیدر علی کے حالات ملتے ہیں، فہرست تلامذۂ علمائے فرنگی محل از مفتی محمد نعمت اللہ فرنگی محلی، تذکرۂ علمائے فرنگی محل از مولوی عنایت اللہ فرنگی محلی، نزہتہ الخواطر از مولوی حکیم عبدالحی۔ عزیز محترم مفتی محمد رضا انصاری فرنگی محلی لکچرر شعبۂ دینیات سنی، علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی نے ان کتابوں کا بالاستیعاب مطالعہ کر کے جو اطلاعات فراہم کیں، ان میں اتنا اختلاف نظر آیا کہ صحیح نتائج نکالنا تقریباً محال ہوگیا۔ مجھ کو میر انیس کے استاد کی حیثیت سے مولوی حیدر علی کے حالات بالخصوص ان کی ولادت اور وفات کی صحیح تاریخوں کی تلاش ہے۔ اوپر حسرت عظیم آبادی کے دو قطعات تاریخ درج کیے گئے ہیں۔ ایک قطعے سے مولوی حیدر علی کا سال وفات ۱۲۹۳ھ نکلتا ہے اور دوسرے سے ۱۲۹۹ھ۔ نزہتہ الخواطر میں بھی ان کا سال وفات ۱۲۹۹ھ لکھا گیا ہے۔

تذکرۂ علمائے ہند میں ہے کہ انتقال کے وقت ان کی عمر چھہتر سال سے زیادہ تھی۔ اگر عمر کا یہ اندازہ صحیح مان لیا جائے، تو ان کا سال ولادت، سال وفات سے تخمیناً چھہتر سال پیشتر یعنی تقریباً ۱۲۱۸ھ یا ۱۲۲۳ھ قرار پاتا ہے۔ میر انیس ۱۲۱۸ھ میں پیدا ہوئے تھے۔ اس طرح وہ مولوی حیدر علی کے ہم سن یا ان سے چھ برس بڑے ٹھہرتے ہیں اور استادی و شاگردی کا رشتہ مشکوک بلکہ ناممکن ہوجاتا ہے۔ جب تک کچھ اور قابل اعتبار مآخذ نہ مل جائیں، اس وقت تک یہ مسئلہ لاینحل ہی رہے گا۔

(بقیہ حاشیہ ص۷۸)

قسطاس البلاغہ کے نام سے ۱۲۹۹ھ میں مرتب اور سنہ ۱۳۰۰ھ میں احسن المطابع عظیم آباد میں طبع ہوا اور راقم کے کتاب خانے میں موجود ہے۔

میر انیس کا سفر حیدرآباد

ڈاکٹر رشید موسوی کے مضمون پر تبصرہ

جنوری ۱۹۶۳ء کے ماہ نامہ نیا دور لکھنؤ میں رشید موسوی صاحب کا ایک مضمون شائع ہوا ہے، جس کا عنوان ہے میر انیس حیدر آباد میں۔ اس مضمون میں کئی باتیں ایسی آگئی ہیں جو صحت سے قریب ہیں مگر بالکل صحیح نہیں ہیں۔ ذیل میں اُن باتوں کو لکھ کر ان کی تصحیح کی جاتی ہے۔

— ادیب

(۱) نواب تہور جنگ بہادر نے میر انیس کو حیدر آباد بلانے کے لیے جن لوگوں کے ذریعے سے کوشش کی تھی، ان کے نام یوں لکھے گئے ہیں:

"شمس العلما شریف الحسن صاحب جن کا وطن لکھنؤ تھا"

"میر انیس کے ایک اور شناسا حامد حسین ۔۔ ۔۔ ۔۔ لکھنؤ کے رہنے والے تھے"

پہلا نام مع خطاب غلط ہے۔ صحیح یوں ہے، 'شریف العلما مولوی سید شریف حسین' ان کا وطن لکھنؤ بتایا گیا ہے۔ یہ بھی صحیح نہیں ہے۔ وہ جگراؤں (پنجاب) کے رہنے والے تھے۔ دوسرا نام تو صحیح ہے، مگر وہ جن لفظوں کے درمیان میں آیا ہے اُن سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ کسی معمولی درجے کے غیر معروف آدمی کا نام ہے۔ حالانکہ اس سے مراد ہیں شمس العلما مولانا سید حامد حسین صاحب قبلہ مجتہد جو شمس العلما مولانا سید ناصر حسین صاحب قبلہ مجتہد مرحوم کے والد بزرگوار تھے۔

(۲) نیچے لکھے ہوئے دو شعر انیس سے منسوب کیے گئے ہیں ؎

حیدر آباد دکن سے لکھنؤ — فاصلہ ہے سیکڑوں فرسنگ کا

مطبوعہ ماہ نامہ نیا دور، لکھنؤ۔ مارچ ۱۹۶۳ء۔

کب انیس و انس آئے تھے یہاں فیض ہے یہ سب تہوّر جنگ کا

انس نہ میرانیس سے پہلے حیدرآباد جا چکے تھے نہ ان کے ساتھ گئے تھے۔ میرانیس اُن کے حیدرآباد جانے کا ذکر کیوں کر کر سکتے تھے۔ ظاہر ہے کہ یہ شعر کسی اور نے کہے ہیں۔

(۳) "انیس ذی الحجہ کی ۲۰ یا ۲۹ تاریخ کو حیدرآباد پہنچے۔"

میرانیس کے سفر حیدرآباد سے متعلق شریف العلما کے وہ خطوط جو انھوں نے حیدرآباد سے اپنے بڑے بھائی کو بھیجے تھے اُن کے پوتے سیّد آغا حسین صاحب نے رسالہ 'ہمایوں' لاہور کے نومبر ۱۹۴۲ء کے پرچے میں شائع کر دیے تھے۔ ان کے علاوہ خود میرانیس نے ایک تفصیلی خط حیدرآباد سے اپنے چھوٹے بھائی میر مونس کو لکھا تھا۔ وہ خط میرانیس کے اخلاف میں سے سیّد محمد ہادی صاحب لائق کے پاس محفوظ ہے اور اس کی نقل میرے پاس موجود ہے۔ ان خطوں کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ میرانیس ۲ مارچ ۱۸۷۱ء کو لکھنؤ سے روانہ ہو کر ۱۱ مارچ کو حیدرآباد پہنچے۔ یہ تاریخیں شریف العلما کے خطوط سے ۹ ذی الحجہ اور ۱۸ ذی الحجہ ۱۲۸۷ھ کے مطابق ٹھہرتی ہیں اور میرانیس کے خط بہ نام مونس سے ۱۰ ذی الحجہ اور ۱۹ ذی الحجہ کے مطابق۔ ذی الحجہ کی تاریخوں میں ایک دن کا فرق جو نظر آتا ہے اس کا سبب یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس مہینے کا چاند لکھنؤ میں حیدرآباد سے ایک دن پہلے دیکھا گیا تھا۔ بہرحال میرانیس کے حیدرآباد پہنچنے کی تاریخ ۲۰ یا ۲۹ ذی الحجہ نہیں بلکہ ۱۸ یا ۱۹ ذی الحجہ تھی۔

(۴) "میرانیس ۔۔۔ محرم کی ۲۰ یا ۲۲ تاریخ تک حیدرآباد میں رہے۔"

شریف العلما ایک خط میں جس کا ابتدائی حصہ ۲۳ محرّم کو اور آخری حصہ ۲۴ محرّم کو لکھا گیا تھا تحریر فرماتے ہیں :

"جناب میرانیس فردا ازیں جا روانہ خواہند شد۔"

"۲۴ محرم قریب شام میر صاحب ازیں جا روانہ شدند۔"

اس طرح معلوم ہوتا ہے کہ میرانیس محرّم کی ۲۰ یا ۲۲ تاریخ تک نہیں بلکہ ۲۴ محرّم کی شام تک حیدرآباد میں رہے۔۔۔ ۲۴ محرم = ۱۵ اپریل ۱۸۷۱ء

(۵) "انیس مجلس میں آنے سے پہلے مرثیے کی خوانندگی کی اچھی طرح پیش مشق کر لیا کرتے تھے۔"

پیش مشتق کلمے کے الفاظ غلط فہمی پیدا کر سکتے ہیں۔ میر انیس مرثیہ پڑھنے سے پہلے اس کو اچھی طرح ضرور دیکھ لیتے ہوں گے۔ لیکن معتبر ذریعوں سے معلوم ہوا ہے کہ وہ گھر پر بلند آواز سے مرثیہ پڑھنے کی مشق نہیں کرتے تھے۔

(۶) حیدر آباد کے قیام میں میر انیس کے معمولات یوں بیان کیے گئے ہیں:

"صبح کی نماز کے بعد وہ ناشتے سے فارغ ہوتے اور نو بجے سے گیارہ بجے تک کا وقت ان لوگوں کے ساتھ گزارتے جو ان سے ملنے کے لیے وہاں آتے تھے۔ اُن کا دوپہر کا کھانا گیارہ بجے ہوتا۔ کھانے کے بعد کچھ دیر آرام کرتے اور پھر ظہر کی نماز کے بعد التزام کے ساتھ قیلولہ کرتے۔ سہ پہر کو اٹھ کر ہاتھ منہ دھو کر ملاقاتیوں سے ملنے کے لیے تیار ہو جاتے۔ ملاقاتوں کا یہ سلسلہ مغرب تک جاری رہتا۔ رات کے کھانے کے بعد کسی سے نہیں ملتے۔ رات کو وہ عموماً جلد سو جایا کرتے تھے۔"

تقسیم اوقات کے اس نقشے میں سونے، کھانے، اور ملاقات کرنے کے سوا کسی اور کام کی گنجائش نہیں ہے۔ معلوم نہیں کہ میر انیس مجلس کس وقت اور کتنی دیر پڑھتے تھے۔ شریف العلما کے ایک خط سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ حیدر آباد میں کچھ وقت مرثیہ کہنے میں بھی صرف کرتے تھے۔ ان کے الفاظ یہ ہیں:

"یک مرثیہ تصنیف می کنند۔ روزے رو بہ روے من خود می گفتند و پسر ایشاں می نوشت۔"

(۷) "انیس جب تک حیدر آباد میں رہے مختار الملک سے ایک مرتبہ بھی ملاقات نہیں کی۔ اس سے اس بات کی مزید توثیق ہو جاتی ہے کہ نواب تہور جنگ اور مختار الملک میں صفائی نہیں تھی۔"

شریف العلما ۱۶ ذی الحجہ کے خط میں لکھتے ہیں:

"حضرت نواب مختار الملک بہادر بہ نواب تہور جنگ گفتند کہ شنیدہ شد کہ میر انیس صاحب می آیند۔ مرد بسیار معقول و نہایت نازک مزاج ہستند باید کہ دقیقہ از دقائق در لوازم مہمانی اوشاں فروگذاشت نہ شود یا ایں کہ خلافِ احتیاط امرے بہ ظہور رسد۔ در خاطر داری اوشاں باید کوشید۔

عرض کردند بچشم۔

یعنی حضرت نواب مختار الملک بہادر نے نواب تہوّر جنگ سے کہا کہ سُنا ہے کہ میر انیس صاحب آرہے ہیں۔ وہ بہت معقول اور نہایت نازک مزاج آدمی ہیں۔ ان کی مہمانی میں کوئی دقیقہ فرو گذاشت نہ ہونے پائے، نہ احتیاط کے خلاف کوئی بات پیش آئے۔ چاہیے کہ ان کی خاطرداری میں کوشش کی جائے [تہوّر جنگ بہادر نے] عرض کیا بسروچشم۔

اس واقعے میں مختار الملک اور نواب تہوّر جنگ کی باہمی کشیدگی کا کوئی پہلو نہیں نکلتا۔ بالخصوص میر انیس کی قدرشناسی اور خاطرداری میں کسی طرح کا اختلاف ان دونوں میں نظر نہیں آتا۔

نواب عنایت جنگ کا بیان ہے کہ نواب مختار الملک سر سالار جنگ میر انیس کی ملاقات کے خواہش مند تھے۔ انھوں نے کوتوال کو بھیج کر میر انیس سے اس خواہش کا اظہار کیا۔ میر صاحب تہوّر جنگ کے مہمان تھے۔ اس لیے اس خواہش کا اظہار اور وقت ملاقات کا تعین تہور جنگ کے توسط سے ہونا چاہیے تھا۔ اس بنا پر وہ ان کی ملاقات کو نہ گئے۔

(۸) "اظہری کے بیان کے مطابق نواب تہوّر جنگ نے انھیں تین ہزار روپے دیے۔ ... ... یہ صحیح نہیں ہے۔ نواب تہوّر جنگ نے انھیں پانچ ہزار روپے نذرانہ دیا تھا۔ اس کے علاوہ آمدورفت کا خرچ اور خلعت بھی دیا تھا۔ خلعت میں کُرتے کے لیے بہترین ململ، اورنگ آباد کا ہمرو تمان[1] اور پانچ سو روپے کا دوشالہ بھی تھا۔"

شریف العلما کے خطوں سے معلوم ہوتا ہے کہ نواب تہوّر جنگ نے تین ہزار روپے پیش کرنے کا ارادہ کیا تھا، لیکن میر انیس کے نامنظور کر دینے پر اس رقم کو بڑھا کر چار ہزار

---

[1] لفظ تمان کے معنی میرے استفسار پر ڈاکٹر رشید موسوی نے یہ لکھے ہیں "تمان ڈھیلا ڈھالا مولنہ پاجامہ ہوتا تھا جو ہمرو، کمخاب، مشروع اور اطلس وغیرہ سے بنایا جاتا تھا۔ تقریبوں میں یہ تمان صاحب حیثیت لوگ ضرور استعمال کرتے تھے"۔ یہ فارسی لفظ تنبان کی بگڑی ہوئی صورت معلوم ہوتی ہے جو ایک طرح کا پاجامہ ہوتا تھا۔ ادیب

روپے سکۂ کمپنی کردیا تھا اور زادِراہ اسی چار ہزار میں شامل تھا۔ لیکن ممکن ہے میر انیس کے کمالِ مرثیہ گوئی و مرثیہ خوانی کو توقع سے زیادہ پاکر ان کی عظیم شخصیت سے متاثر ہو کر طے کی ہوئی رقم سے زیادہ نذر کردی ہو۔

رشید موسوی صاحبہ نے جو باتیں اپنے اس مضمون میں لکھی ہیں وہ حیدرآباد کے معمر بزرگ نواب عنایت جنگ بہادر سے دریافت کرکے لکھی ہیں اور موصوف سے زیادہ معتبر راوی مل نہیں سکتا۔ اس لیے کہ میر انیس کو حیدرآباد بلانے والے نواب تہور جنگ کے وہ فرزند رشید ہیں۔ میر انیس کا حیدرآباد میں عارضی قیام آج سے بانوے[۹۲] سال پہلے کا واقعہ ہے۔ اس کی جو تفصیلات نواب عنایت جنگ بہادر نے اپنے بزرگوں سے سُنا انھیں جس حد تک یاد رکھا، وہ بھی حیرت خیز ہے۔ لیکن اگر اتنی طویل مدت کے بعد حافظہ کچھ غلطی کرے تو یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے۔ مثلاً ان کا بیان ہے کہ میر انیس کو حیدرآباد آنے کی دعوت دینے کے سلسلے میں جو خط و کتابت ہوئی تھی وہ ان کے پاس محفوظ تھی اور انھوں نے مسعود حسن رضوی کو دے دی۔ اس معاملے میں ان کا حافظہ دھوکا دے رہا ہے۔

میر انیس کے سفر حیدرآباد کا روزنامچہ

حیدرآباد کے صاحب عزت و ثروت رئیس نواب تہور جنگ بہادر کو مجالس عزا کا شوق تھا۔ جگراؤں (پنجاب) کے رہنے والے ارسطو جاہ مولوی رجب علی کے فرزند شریف العلما مولوی شریف حسین جو حیدرآباد میں ناظم عدالت تھے، ان کی تحریک پر انھیں کے ذریعے سے تہور جنگ بہادر نے میر انیس کو حیدرآباد آنے کی دعوت دی۔ شریف العلما نے میر انیس سے خط کتابت کر کے اور شمس العلما مولوی سید حامد حسین صاحب مجتہد سے سفارش کروا کے میر انیس کو حیدرآباد کے سفر پر رضامند کر لیا۔ جس وقت سے نواب تہور جنگ نے میر انیس کو بلانے کا ارادہ کیا اور جس وقت تک میر انیس حیدرآباد میں قیام پذیر رہے، شریف العلما تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد ایک ایک بات اپنے بڑے بھائی صاحب کو لکھتے رہتے تھے۔ ان کے خطوط گویا ایک روزنامچہ ہیں جس میں میر انیس کے سفر اور قیام کی تمام تفصیلات درج ہیں۔ ان خطوں میں سے چند خط شریف العلما کے پوتے سید آغا حسن صاحب نے "میر انیس کا سفر دکن" کے عنوان سے رسالہ ھمایون لاہور بابتہ نومبر ۱۹۴۰ء میں شائع کر دیے تھے۔ چند خط اردو میں اور بیشتر خط فارسی میں ہیں۔ ذیل میں اردو خطوں کے ضروری اقتباسات اور فارسی خطوں کے ضروری حصے اردو میں ترجمہ کر کے تاریخ وار درج کیے جاتے ہیں۔

تین خط اور ہیں جن سے اس سفر کے بارے میں کچھ مستند معلومات حاصل ہوتی ہیں۔ ایک خط میر انیس کا ہے جو انھوں نے ۱۴ اپریل ۱۸۷۱ء کو حیدرآباد سے میر مونس کے نام لکھا تھا، ایک خط میر مونس کا ہے جو انھوں نے ۱۴ ذی الحجہ ۱۲۸۶ھ کو میر انیس کے حد درجہ عقیدت مند حکیم سید علی کے نام دولہی پور ضلع بنارس بھیجا تھا اور ایک خط میر مونس

• مطبوعہ ماہنامہ نیا دور، لکھنؤ۔ ستمبر ۱۹۷۱ء۔

کا ہے جو انھوں نے ۱۹ ربیع الاول ۱۲۸۸ھ کو انھیں حکیم سید علی کے نام لکھا تھا۔ ان غیر مطبوعہ خطوں کے ضروری اقتباس بھی درج کیے جا رہے ہیں۔

شریف العلما کے خطوط

(۱) مورخہ ۱۳ رمضان ۱۲۸۶ھ = ۰ر دسمبر ۱۸۶۹ء

جناب مولوی حامد حسین صاحب قبلہ کا خط آیا کہ میر انیس کو تین ہزار منظور نہیں۔ چنانچہ اب نواب تہور جنگ بہادر نے دوسرا خط لکھوایا ہے کہ اگر میر انیس صاحب آئیں تو چار ہزار کمپنی اور اگر مونس آئیں تو تین ہزار کمپنی ہر سال دوں گا۔

(۲) مورخہ ۱۲ شوال ۱۲۸۶ھ = ۴ر جنوری ۱۸۷۰ء

پرسوں مولوی حامد حسین صاحب قبلہ کا خط آیا کہ میر انیس صاحب کو چار ہزار پر تشریف لانا منظور ہے۔ لہٰذا نواب تہور جنگ بہادر سے ایک خط مہری مع پانچ سو روپیا زادِ راہ لے کر روانہ کر دو۔ چنانچہ اس وقت مسودہ بہ نام میر انیس صاحب کر چکا ہوں، صاف کر کے روانہ کر دوں گا۔

(۳) مورخہ ۲۲ شوال ۱۲۸۶ھ = ۱۵ جنوری ۱۸۷۰ء

میر انیس صاحب کا زادِ راہ اسی چار ہزار میں طے ہوا ہے اور خط مہری نواب تہور جنگ بہادر کا بہ نام میر صاحب روانہ ہو گیا ہے۔

(۴) مورخہ ۱۸ ذی قعدہ ۱۲۸۶ھ = ۹ر فروری ۱۸۷۰ء

تمام شہر میں شہرہ ہو گیا ہے کہ میر صاحب آ رہے ہیں۔ غرض عجیب کیفیت قابلِ ملاحظہ ہے۔ میر انیس صاحب کا خط جو میرے نام آیا ہے وہ ملفوف ہے، اس خط میں میر انیس صاحب نے میرے حال پر عنایت فرمائی ہے اور مجھ کو موردِ عنایات قدیمی قرار دیا ہے آج میر انیس صاحب کے خط کے جواب میں تار بھیج دیا گیا ہے۔ کل پانچ سو روپے زادِ راہ مولوی حامد حسین صاحب قبلہ کی معرفت روانہ کیے جا چکے ہیں۔ غالباً ۱۲ ذی الحجہ تک میر صاحب اس شہر میں وارد ہو جائیں گے۔

(۵) مورخہ ۲۱ ذی قعدہ ۱۲۸۶ھ = ۱۲ر فروری ۱۸۷۰ء

میر انیس صاحب اول ذی الحجہ کو وہاں سے روانہ ہوں گے۔ مجلس کی بڑی بڑی تیاریاں ہوئی ہیں۔ چاندنیاں سی جا رہی ہیں، جگہ جگہ سے سائبان [یعنی شامیانے]

منگوائے گئے ہیں، مکانوں میں سفیدی ہو رہی ہے۔

(۶) مورخہ ۴ ذی الحجہ ۱۲۸۶ھ = ۲۴ فروری ۱۸۷۰ء۔

داد دینے کا یہاں دستور نہیں ہے لیکن دو تین سو ہندستانی ہیں، وہ تعریف کریں گے۔ ۔ ۔ اب تو میر صاحب ہمیشہ کے واسطے یہاں مقرر ہوئے ہیں۔ ۔ ۔ کل میرے نام حکیم وزیر مرزا صاحب کا خط آیا ہے اور مولوی حامد حسین صاحب کا بھی کہ اب میر انیس بہ روز پنج شنبہ ۹ ذی الحجہ کو لکھنؤ سے روانہ ہوں گے اور تار پر خبر بھیجی جائے گی۔

(۷) مورخہ ۱۲ ذی الحجہ ۱۲۸۶ھ = ۶ مارچ ۱۸۷۰ء

جناب میر انیس صاحب اس وقت تک نہیں پہنچے ہیں لیکن روز جمعہ ۳ مارچ کو لکھنؤ سے تار آیا ہے کہ میر صاحب دوم مارچ روز پنج شنبہ لکھنؤ سے روانہ ہوئے ہیں، آئندہ شنبے تک پہنچ جائیں گے۔

حضرت نواب مختار الملک بہادر نے نواب تہور جنگ بہادر سے کہا، سنا گیا ہو کہ میر انیس صاحب آرہے ہیں۔ بہت معقول اور نازک مزاج آدمی ہیں۔ ان کے لوازم مہمانی میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا جائے نہ کوئی امر خلاف احتیاط پیش آئے، چاہیے کہ ان کی خاطر داری میں کوشش کی جائے۔

تمام شہر میں ان کی تشریف آوری کا عجب شہرہ ہے۔ پیش کار یعنی نائب دیوان راجہ اندر نرائن جو راجہ چندو لال کے پوتے اور دس ہزار روپے ماہوار کے تنخواہ دار ہیں، میر انیس صاحب کے مشتاق ہو کر کہتے ہیں کہ محرم کے بعد ایک مجلس اپنے گھر میں کروں گا اور تمام بڑے بڑے امرا کو مدعو کر کے میر انیس صاحب کو سنوں گا۔

نواب تہور جنگ بہادر میر صاحب کے استقبال کے لیے تیار بیٹھے ہیں۔ بندہ بھی ان کے ہم راہ جائے گا۔ یہاں سے دس کوس کے فاصلے پر طالب الدولہ مرحوم کے باغ میں بہ مقام پٹن چرو استقبال کریں گے۔

(۸) مورخہ ۲۱ ذی الحجہ ۱۲۸۶ھ = ۱۳ مارچ ۱۸۷۰ء

الحمد للہ کہ جناب میر انیس صاحب قبلہ ۱۸ ذی الحجہ کو عید غدیر کے دن شام کے قریب یہاں پہنچ کر اس شہر کے لیے اس آیت کے مصداق ہو گئے۔ اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ۔ اس وقت سے ایک ہجوم ہے۔ نواب

تہور جنگ بہادر اور بندہ جناب کے ہم نشین ہیں۔ عرض نہیں کر سکتا ہوں کہ کیا لطف حاصل ہوتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ جناب میر انیس کا پڑھنا دلوں کے لیے مقناطیس ہے۔ آج اپنے چند شعر پڑھے تھے۔ یہاں کے نافہم لوگ ہمہ تن گوش ہو گئے، اہل فن کا کیا ذکر جناب میر انیس صاحب سترویں سال میں ہیں، لیکن بہت توانا ہیں اور دس دن تک مرثیہ پڑھنے کے لیے مستعد ہیں۔ فرماتے ہیں کہ میں نے میر نواب [مونس] اور میر خورشید علی [نفیس] کا کلام کبھی نہیں پڑھا۔

خط لکھنے کا دن حسب معمول کل تھا، لیکن جناب میر انیس کی تشریف آوری اور مہمان داری سے فرصت نہیں ہے۔ چونکہ اس وقت خواب استراحت فرما رہے ہیں یہ چند حرف بر صدر وقت لکھے ہیں کیونکہ طبیعت خط لکھنے کی طرف بالکل مائل نہیں ہو۔

(۹) مورخہ ۲۵ ذی الحجہ ۱۲۸۷ھ = ۱۷ مارچ ۱۸۷۱ء

جناب میر انیس صاحب سے بہت دفعہ ملاقات ہوئی اور ہر روز ہوتی ہے۔ بڑے خوش صفات آدمی ہیں۔ مزاج میں امارت مطلقاً داخل نہیں ہے۔ بڑے سادہ طبیعت ہیں۔ اکثر اوقات نور محمد اور سندے خاں [ملازمین شریف العلما] سے باتیں کرتے ہیں اور مہربانی سے پیش آتے ہیں۔ ۔ ۔ ۔

آج کل لکھنؤ میں ان کا وقت برا گزر رہا ہے۔ کسی جگہ سے کوئی سبیل نہیں رہی ہے۔ سرکار دولت مدار گورنمنٹ کی طرف سے پندرہ روپے اس کے صلے میں عطا ہوتے ہیں کہ مصنف سید میر ضاحک یعنی میر حسن مصنف سحر البیان کے پوتے ہیں اور حکیم بندے مہدی بخت کے وثیقے سے چالیس روپے دیتے تھے وہ بند ہو گئے۔ بہ درجہ مجبوری سفر اختیار کیا ہے۔

یہاں پہنچ کر آب و ہوا کی تبدیلی سے میر صاحب کو کھانسی ہو گئی ہے، انشاءاللہ صحت ہو جائے گی۔ ایک مرثیہ تصنیف کر رہے ہیں۔ ایک دن میرے سامنے خود کہتے جاتے تھے اور ان کے بیٹے لکھتے جاتے تھے۔ کہتے تھے کہ ایک عرصے سے مرثیہ کہنا اور پڑھنا ترک کر دیا ہے اور اب اس کی طاقت بھی نہیں ہے۔ تاہم سب سے بہتر ہیں۔

(۱۰) مورخہ ۲۹ ذی الحجہ ۱۲۸۷ھ = ۲۱ مارچ ۱۸۷۱ء

میر انیس صاحب کے پاس اکثر بیٹھتا ہوں ۔ ۔ ۔ میر انیس فی الواقع بے نظیر آدمی ہیں۔ بڑے غیور، خوش اخلاق اور نیک مزاج اور نہایت خوش تقریر ہیں کہ انسان محو ہو جاتا ہے۔ اگر کسی بات کا ذکر کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ اس سے بہتر کچھ نہیں ہو سکتا۔ لیکن بیمار ہو گئے ہیں۔ معلوم نہیں کے دن مرثیہ پڑھنے کا اتفاق ہوتا ہے۔

جناب نواب مختار الملک بہادر نے مجلس کے لیے ایک سائبان [شامیانہ] بھیجا ہے جس کا طول بیس گز اور عرض بیس گز ہے اور ایسے ہی چوبی تخت۔

میر انیس نے میر تقی کے دو شعر پڑھے ؎

تیری گلی میں ہم نہ چلیں اور صبا چلے
یونہی خدا جو چاہے تو بندے کا کیا چلے

تھمتے تھمتے تھمیں گے آنسو
رونا ہے یہ کچھ ہنسی نہیں ہے

کہتے ہیں کہ اس وقت لکھنؤ میں سو سے زیادہ مرثیہ گو ہیں اور بڑے بڑے لوگوں نے یہ شیوہ اختیار کر لیا ہے۔ میں جو مرثیہ کہتا ہوں اس کو خراب کرتے ہیں اور میرے محاورات کا سرقہ کرتے ہیں۔

میر انیس کو شدت سے بخار ہے۔ حق تعالیٰ شفا دے۔

(۱۱) مورخہ ۴ محرم ۱۲۸۸ھ = ۲۶ مارچ ۱۸۷۱ء

آج محرم کی چوتھی تاریخ ہے اور میر انیس صاحب ضعفِ پیری اور ضعفِ مرض کے باوجود ہر روز مرثیہ پڑھتے ہیں۔ جو کیفیت حاصل ہوتی ہے اس کو عرض نہیں کر سکتا ہوں۔ سارا حیدر آباد مشتاق بلکہ انیسیہ ہو گیا ہے۔

سندے خاں اور حاجی نور محمد جناب میر انیس کی مہمان داری کے اہتمام میں اس قدر مصروف ہیں کہ نواب تہور جنگ بہادر ان سے بہت خوش ہیں۔

(۱۲) مورخہ ۱۲ محرم الحرام ۱۲۸۸ھ = ۳ اپریل ۱۸۷۱ء

آدھے محرم تک مجالسِ عزا بڑے زور شور کی ہوئیں۔ کسی مجلس میں پانچ ہزار

سامعین سے کم نہ تھے۔ یہاں کے معمر لوگ کہتے ہیں کہ سَو برس سے ایسی مجلسیں اور مجمع یہاں نہیں ہوئے تھے۔ خاص کر نویں تاریخ کو میر صاحب نے ایک مرثیہ پڑھا جو اس مرثیے کا جواب تھا... جو انھوں نے لکھنؤ میں ہماری مجلس میں پڑھا تھا اور اس سے ہزاروں درجہ بہتر۔ اس کے چند مصرعے یاد ہیں ؎

تیغ و سپر جو ہیں شہِ خوشخو لیے ہوئے — غل ہے کہ ہاں نجات کا پہلو لیے ہوئے

ٹیپ ؎

شبیر تو امام ہے ابن امام ہے — گر غیظ آگیا تو یہ قصہ تمام ہے

ایضاً ؎

ہاں لنگرِ سفینۂ دیں کس طرح ہٹے — اور قطبِ آسمان و زمیں کس طرح ہٹے

نقطہ ہے دائرے سے یہ باہر نہ ہوئے گا[1]

ایضاً در مرثیۂ فرزندانِ حضرت زینب خاتون ؎

اس طرح سے لڑتے تھے جو دو تشنہ دہاں دو — دو لاکھ کے لشکر میں یہ غل تھا کہ اماں دو

فرمایا کہ لشکر کے نشاں دو تو اماں دیں — گر صلح کی حضرت سے زباں دو تو اماں دیں

اصغر کو جو یہ آب رواں دو تو اماں دیں[2]

مختصر یہ کہ یہاں کے لوگ اس قدر محظوظ ہوئے کہ کوئی حد نہیں۔

محرم کی آٹھویں تاریخ کو جناب مختار الملک بہادر نے داروغہ عبدالوہاب کو بھیجا کہ میں بہت مشتاق ہوں، ایک مجلس کرنا چاہتا ہوں۔ چنانچہ گیارھویں تاریخ مجلس قرار پاگئی ہے۔ نواب صاحب کی والدہ اور خود نواب صاحب مجلس میں رونق بخش ہوں گے اور مبلغ دو ہزار قرار پائے ہیں۔

(۱۳) مورخہ ۱۲ محرم ۱۲۸۸ھ = ۳ اپریل ۱۸۷۱ء

جناب میر صاحب کے تشریف لے جانے میں ابھی کچھ تامل ہے۔

(۱۴) مورخہ ۱۵ محرم ۱۲۸۸ھ = ۶ اپریل ۱۸۷۱ء

---

[1] یہ مصرعے اس مرثیے میں ہیں جس کا مطلع ہے 'جب خاتمہ بخیر ہوا فوج شاہ کا'

[2] یہ مصرعے اس مرثیے میں ہیں جس کا مطلع ہے 'دوزخ سے جو آزاد کیا حُر کو خدا نے'

آپ کے خط میں لکھے ہوئے جملہ مضامین جناب میر صاحب قبلہ کی خدمت میں پہنچا دیے۔ کمال درجہ شکر گزار ہوئے۔ کہتے ہیں کہ میں جناب علییمن آب [ارسطو جاہ بہادر مرحوم] طاب ثراہ کے کل خاندان و اولاد کا ممنون ہوں۔

(۱۵) مورخہ ۲۰ محرم ۱۲۸۸ھ = ۲۴ اپریل ۱۸۷۱ء

حضور نواب مختار الملک بہادر نے میر انیس کی جو مجلس تجویز کی تھی اس کو بعض دور اندازوں نے درہم برہم کر دیا۔ اب یہاں سے میر صاحب کی روانگی ۲۳ محرم کو مقرر ہوئی ہے۔ نور محمد ان کے ساتھ جائے گا۔

(۱۶) مورخہ ۲۳ محرم ۱۲۸۸ھ = ۲۴ اپریل ۱۸۷۱ء

جناب میر انیس کل یہاں سے روانہ ہوں گے۔ نور محمد بھی ان کے ہم راہ ہے۔ یہاں کی مفصل کیفیت یہ ہے کہ میر انیس صاحب بیسویں محرم کو نواب تہور جنگ بہادر کے مکان سے آ کے تہور جنگ اور ان کے آدمیوں کے ساتھ ٹیپو میاں کے باغ میں مہمان ہیں۔ بلا مبالغہ اس قدر مہمان داری کر رہے ہیں جس کی حد نہیں۔ یہاں تک کہ ۲۴ محرم کو قریب شام میر صاحب ممدوح یہاں سے روانہ ہو گئے۔ ٹیپو صاحب نے پانچ سو روپے کی اشرفیاں ان کے بازو پر باندھ دیں۔ خلاصہ یہ کہ یہاں سے بہت خوش گئے ہیں۔

میر انیس کا خط مورخہ ۱۴ اپریل ۱۸۷۱ء بہ نام میر مونس

عید اضحیٰ کے دن رخصت ہو کر بہت سی منزلیں طے کر کے میں حیدر آباد پہنچا حسین ساگر تک جو کہ انگریزوں کی چھاؤنی ہے تہور جنگ بہادر نے اپنے عزیزوں اور شہر کے بڑے بڑے امیروں کے ساتھ استقبال کر کے بڑے شوق سے اپنے مکان پہنچایا اور یہاں جو مہمان داری کا حق ہے اس میں کوئی دقیقہ فرو گزاشت نہیں کرتے ہیں۔ انیسویں تاریخ [ذی الحجہ] کو یہاں پہنچا۔ رات صحت سے گزری۔ صبح کو نزلے کی تحریک اور کھانسی ہو گئی اور شام کو بخار آ گیا۔ بخار، درد سر اور غفلت کی وجہ سے چھ دن برابر کھانے پانی سے واقف نہیں ہوا۔ محرم کی ابتدا تک یہی حال رہا۔ پہلی تاریخ [محرم] کو قریب پانچ ہزار آدمیوں کا مجمع ہو گیا تو تہور جنگ میرے پاس آئے اور کہا کہ اگر طاقت ہو تو مجلس میں شرکت کیجیے تاکہ مجلس کی برکت سے مرض

میں تخفیف ہوجائے۔ عجیب حالِ زار سے مجلس میں پہنچا۔ میر محمدؐ [سلیس] سے پڑھنے کے لیے کہا۔ انھوں نے چند بند پڑھ کے ختم کردیا۔ میں اسی حال میں اٹھ کر منبر پر گیا اور چند بند آہستہ آہستہ پڑھے۔ فقط سید الشہدا کی تائید تھی کہ مجلس کا رنگ دگرگوں ہوگیا۔ معلوم ہوتا تھا کہ میں لکھنؤ میں پڑھ رہا ہوں۔ پڑھنے کے بعد تمام مجلس جو امیروں اور دوسرے عقیدے کے لوگوں سے بھری ہوئی تھی میرے پیروں پر گر پڑی۔

اس دن سے بخار کی شدت میں سات دن برابر بڑھتا رہا۔ روزانہ سات ہزار آدمیوں سے کم نہ ہوتے تھے اور نویں تاریخ کو مجلس کا حال کیا لکھوں۔

محرم کے بعد بھی کامل صحت نہیں ہوئی۔ روزانہ یہاں سے روانہ ہونے کا قصد کرتا ہوں لیکن لوگ نہیں چھوڑتے۔

مختارالملک بہادر مجلس کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں لیکن ضعف اور کھانسی کی اب بھی شدت ہے۔ میں نے انکار کردیا۔ اب کہتے ہیں کہ مجھ سے ملاقات کر کے جائیں۔ مگر میں نے کہلا بھیجا کہ میں جلد حاضر ہوکر ماہ شعبان میں ملازمت حاصل کروں گا کیونکہ اس وقت طرح طرح کے عوارض کی وجہ سے بیٹھنے کی طاقت بھی نہیں ہے۔

اگر خدا نے چاہا اور سید الشہدا نے مدد فرمائی تو یہاں سے جلد روانہ ہوجاؤں گا۔ اپنے خیال میں بیسویں تاریخ [محرم] قرار دی ہے آئندہ جو خدا کی مرضی۔ دعا کرو کہ اس شہر سے نجات پاؤں اور اپنی جان سلامت لے جاؤں۔ وقت ملاقات، اگر زندہ پہنچ گیا تو سب حالات بیان کروں گا۔ اس وقت ضعف مانع ہے۔

میر مونس کا خط مورخہ ۱۴ ذی الحجہ ۱۲۸۶ھ بہ نام حکیم سید علی

دسویں تاریخ عید اضحیٰ کے دن جناب برادر صاحب مع سید عسکری و سید محمد و دو خدمت گار اور دو شخصوں کے نواب تہور جنگ بہادر کی طلب پر حیدرآباد تشریف لے گئے۔

میر انیس کا خط مورخہ ۱۹ ربیع الاول ۱۲۸۸ھ بہ نام حکیم سید علی

میر صاحب بہ تعجیل تمام حیدرآباد سے تشریف لے آئے۔ پانچ ہزار روپے ان کو ملے۔

نواب عنایت جنگ کا بیان

اوپر جن خطوط کے اقتباسات پیش کیے گئے ہیں وہ میر انیس کے سفر حیدرآباد

کے مستند ترین ماخذ ہیں۔ ان کے علاوہ نواب تہوّر جنگ بہادر کے فرزند نواب عنایت جنگ کا بیان بھی ہے، جس کو ایک حد تک معتبر سمجھ سکتے ہیں۔ ایک حد تک اس لیے کہ انھوں نے جو حالات بیان کیے ہیں وہ اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھے تھے، بزرگوں سے سُنے تھے اور میر انیس کے چند روزہ قیام حیدر آباد سے کوئی نوّے سال کے بعد بیان کیے ہیں۔ اتنی طویل مدّت کے بعد حافظے کا غلطی کرنا ممکن ہے۔

ڈاکٹر رشید موسوی نے میر انیس کے سفر حیدر آباد کے حالات نواب تہور جنگ بہادر کے فرزند رشید نواب عنایت جنگ اور حیدر آباد کے دوسرے معتبر بزرگوں سے دریافت کرکے لکھے ہیں۔ ان کا بیان ہے کہ اس زمانے میں لکھنؤ سے حیدر آباد جانے کا راستہ لطہارشاہ اور قاضی پیٹھ کی طرف سے نہیں تھا، کیونکہ یہ ریلوے لائن ابھی بنی نہیں تھی۔ اس لیے وہ بمبئی، پونا کی راہ سے گلبرگہ پہنچے۔ گلبرگہ سے حیدر آباد تک ریلوے لائن کا سلسلہ نہیں تھا اس لیے تہور جنگ نے گھوڑا گاڑی دبدرقہ کے ساتھ تعلقداروں میں سے چند اور لوگوں کی کافی تعداد کو استقبال کے لیے گلبرگہ روانہ کیا۔ گلبرگہ سے انیس گھوڑا گاڑی کے ذریعے حیدر آباد آئے۔ جب انیس کے حیدر آباد پہنچنے کی خبر ملی تو تہوّر جنگ نے اپنے دوست احباب کی کثیر تعداد کے ساتھ دلی دروازے کے پاس جاکر انیس کا استقبال کیا۔ اور اپنے ساتھ لاکر اپنی ڈیوڑھی میں بالائی منزل پر ان کو مقیم کیا۔ یہ ڈیوڑھی میر عالم کی منڈی کے پاس دارالشفا کے قریب واقع ہے۔ گلبرگہ سے حیدر آباد تک گھوڑا گاڑی پر سفر کرنے کے تکان سے میر انیس کو زکام اور حرارت ہوگئی۔ استخارہ کرکے ڈاکٹر مرزا علی کا علاج شروع کیا گیا جس سے فائدہ ہوا۔[1]

انھیں محترمہ (ڈاکٹر رشید موسوی) نے نواب عنایت جنگ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ پہلی محرم کو میر انیس نے مرثیہ شروع کرنے سے پہلے یہ رباعی پڑھی ؎

اللہ و رسول حق کی امداد رہے　　سرسبز یہ شہر فیض بنیاد رہے
نواب ایسا رئیس اعظم ایسے　　یارب آباد حیدر آباد رہے

رباعی کے بعد وہ مرثیہ پڑھا جس کا مطلع ہے "بخدا فارس میدان تہوّر تھا حُرؑ"

---

[1] دکن میں مرثیہ اور عزاداری ۱۸۵۰ء تا ۱۹۵۰ء صفحہ ۱۱۳-۱۱۴

جب مرثیہ شروع کیا تو ایک سماں بندھ گیا اور چاروں طرف سے واہ واہ کا شور بلند ہوا۔ لیکن کمزوری اور تکان کا اثر ابھی باقی تھا، اس لیے چودہ بند پڑھ کر منبر سے اتر آئے[1]۔ میر انیس نے عشرۂ محرم میں دس مجلسیں پڑھیں۔ جب مجلس بھر جاتی تھی تو میر انیس کو اطلاع کی جاتی تھی اور وہ اوپر سے اتر کر مجلس میں داخل ہوتے تھے اور منبر کے دوسرے زینے پر بیٹھ کر مرثیہ پڑھتے تھے۔ مرثیہ ختم کر کے منبر سے اتر کر قریب ہی بیٹھ جاتے تھے اور دیر میں لوگ ان سے ملاقات کرتے تھے۔ مجلس میں وہ ململ کا کرتہ، چوگوشیہ ٹوپی اور گھیردار پاجامہ پہنتے تھے اور مرثیہ پڑھتے وقت گھٹنوں پر سفید رومال ڈال لیتے تھے۔ مرثیہ پڑھتے میں اگر حلق خشک ہو جاتا تھا تو بھی پانی نہیں پیتے تھے۔

جب میر انیس حیدرآباد سے جانے لگے تو:

"تہور جنگ نے پانچ ہزار نقد نذرانہ دیا تھا۔ اس کے علاوہ آمد و رفت کا خرچ اور خلعت بھی دیا تھا۔ خلعت میں کرتے کے لیے بہترین ململ، اورنگ آباد کا ہمرو[2] تمان[3] کے لیے اور پانچ سو روپے کا دوشالہ بھی تھا[4]۔"

شریف العلما کے خطوں سے معلوم ہوتا ہے کہ نواب تہور جنگ نے تین ہزار روپے پیش کرنے کا ارادہ کیا تھا۔ لیکن میر انیس کے نامنظور کر دینے پر اس رقم کو بڑھا کر چار ہزار روپے سکہ کمپنی کر دیا تھا اور زاد راہ اسی چار ہزار میں شامل تھا۔ لیکن ممکن ہے کہ میر انیس کے کمال مرثیہ گوئی و مرثیہ خوانی کو توقع سے زیادہ پا کر اور ان کی عظیم شخصیت سے متاثر ہو کر طے کی ہوئی رقم سے زیادہ نذر کر دی ہو۔

توضیحات

گلبرگہ سے حیدرآباد جانے کے دو راستے تھے۔ ایک کا فاصلہ ۱۴۴ میل اور دوسرے کا ۱۲۴ میل تھا۔ کوئی پختہ سڑک نہ تھی، صرف کچے راستے اور پگ ڈنڈیاں تھیں۔

حسین ساگر کی شمالی حد سے شہر حیدرآباد کا فاصلہ تقریباً ۴ ½ میل اور جنوبی حد

---

[1] دکن میں مرثیہ اور عزاداری (۱۸۵۰ء تا ۱۹۵۰ء) صفحہ ۱۰۵۔

[2] ہمرو: ایک خوش رنگ قیمتی کپڑا۔

[3] تمان: ڈھیلا ڈھالا مردانہ پاجامہ۔ یہ تنبان (تبان) کی بگڑی ہوئی صورت معلوم ہوتی ہے۔

[4] دکن میں مرثیہ اور عزاداری صفحہ ۱۲۰

سے تقریباً ۲ میل ہے۔ بعض قرائن سے اندازہ کیا گیا ہے کہ میر انیس جیین ساگر کی شمالی حد سے حیدر آباد میں داخل ہوئے ہوں گے اور وہیں ان کا ابتدائی استقبال ہوا ہوگا۔

تہور جنگ کی ڈیوڑھی میر عالم کی منڈی اور پرانی حویلی کے درمیان تھی وہاں سے دلّی دروازے کا فاصلہ ایک میل ہے۔ اسی دروازے پر میر انیس کا شاندار استقبال کیا گیا تھا۔ دلّی دروازہ اب حیدر آباد کے دوتین اور دروازوں کی طرح منہدم ہو چکا ہے۔

تہور جنگ کی ڈیوڑھی کے دالان در دالان میں میر انیس نے مجلسیں پڑھی تھیں۔ اس کے متصل ایک وسیع صحن ہے۔

ٹیپو صاحب ریاست حیدر آباد کے ایک دولت مند جاگیردار تھے۔

میر انیس کی بیماری

از خطوط میر نواب مونس بہ نام حکیم سید علی۔

جمادی الثانی ۱۲۸۳ھ:

جناب برادر صاحب تپ میں مبتلا ہو گئے تھے۔ ایک ماہ کامل بیمار رہے۔ آٹھ عمل (احتقان) مع بدرقے کے ہوئے۔ خدا کا شکر ہے کہ تپ دفع ہو گئی۔ ضعف کا حال کیا لکھوں، تن درستی کی حالت ہی میں ضعیف تھے۔ اس بیماری سے اور ناتواں ہو گئے ہیں۔

چہار شنبہ ۱۱ محرم ۱۲۸۶ھ:

لکھنؤ سے میر محمد حسین نے لکھا ہے کہ میر صاحب کی طبیعت علیل ہے۔

شعبان ۱۲۸۹ھ:

میر صاحب قبلہ کے مزاج کی درستی کا اعتبار ایک ہفتے کے لیے بھی نہیں ہے۔ اکثر طبیعت نادرست ہو جاتی ہے۔

۹ صفر ۱۲۹۱ھ:

جناب برادر سید انیس صاحب بہ صحت و عافیت ہیں۔

شوال ۱۲۹۱ھ:

ساڑھے تین مہینے سے برادر صاحب کا جو حال ہے وہ آپ کو خطوں سے معلوم ہوا ہوگا۔ اب امراض میں تخفیف ہے۔ عرق مرکب کی تبرید استعمال کی جا رہی ہے اور وہ جناب ممدوح کے لیے بہت نافع ہے۔ شافی حقیقی شفائے کلی عطا فرمائے۔ دو تین مہینے کمال تردد و تشویش میں بسر ہوئے، خاص کر ماہ صیام۔ اب تک غذا پران کی رغبت نہیں ہے۔ مرغ کے چوزے کا شوربا بالفعل شروع کیا گیا ہے اور رات کو یخنی دی جاتی ہے۔ خدائے قادر و توانا سے امید قوی ہے کہ اس ضعف کو قوت سے مبدل کر دے اور اس ساڑھے تین مہینے کے عرصے میں دو تین مرتبہ جو غش ہو چکا ہے اس سے محفوظ رکھے۔

۵ ماہ حال:

آپ کے ارشاد کے مطابق میں نے برادر صاحب قبلہ کی خدمت میں آپ کی تحریر پیش کی۔ فرمایا حکیم صاحب کو لکھ دو کہ آپ میرے حال سے بخوبی واقف ہیں یہ زحمت برداشت کرنا میرے امکان میں نہیں ہے۔ بخدا کسی اور بات کی طرف میری نظر نہیں ہے۔ صرف ضعف اور مزاج کی بے لطفی کا عذر کیا ہے۔

۲۸ ماہ حال یوم جمعہ:

جناب برادر صاحب قبلہ دو مہینے بیمار رہے ضعف بہت ہو گیا ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ اب ناطاقتی کے سوا کوئی مرض نہیں ہے۔

بے تاریخ:

جناب برادر صاحب کبھی صحیح رہتے ہیں کبھی بیمار۔ اس وجہ سے ضعف ہو گیا ہے۔ یقین ہے کہ جاڑوں میں قوت آجائے گی۔

از خطوط میر مہر علی انس بہ نام حکیم سید علی:

۱۷ روز شنبہ:

برادر صاحب قبلہ کی طبیعت علیل ہے۔ کبھی افاقہ ہو جاتا ہے کہ مرض عود کر آتا ہے۔ ایک ہفتے سے درد حوالی کلیہ ریاح کی شرکت کے ساتھ سخت تکلیف دے رہا ہے۔ تنقیے بھی ہوئے، امالہ بھی ہوا۔ اب تک صحت نہیں ہوئی۔ آج پہلے سے کسی قدر سکون ہے۔

۱۵ رجمادی الثانی ۱۲۸۹ھ:

آج کل جناب برادر صاحب میر انیس تپ و لرزہ میں مبتلا ہو کر بہت بیمار ہو گئے تھے۔ مسہل وغیرہ کے بعد اب روبہ صحت ہیں لیکن نقاہت و ناتوانی بےحد ہے۔

۱۷ رجادی الثانی ۱۲۸۹ھ:

اس شہر میں فصلی بخار کا حشر برپا ہے۔ بخار کے بعد درد اعضا کی وجہ سے ہر شخص گھٹنوں اور ہاتھوں کے گٹوں کو باندھے ہوئے ہے۔ بڑے بھائی صاحب کے گھر میں بھی لوگ اس تپ میں مبتلا ہو کر اچھے ہو گئے۔

رمضان ۱۲۹۱ھ:

میر ببر علی صاحب رجب کے مہینے سے بہت علیل ہیں۔ میں نے

ان کی عیادت کے لیے جانے کا قصد کیا تو فرمایا کہ اگر وہ آئیں گے تو میں اپنے چھریاں مار لوں گا اور اگر جنازے پر آئیں تو جب تک وہ جانہ لیں جنازہ نہ اٹھانا، چاہے تین دن گزر جائیں۔ اسی طرح کے اور بہت سے کلمات کہلا بھیجے ہیں۔ میں ابھی تک نہیں گیا۔ مگر میرا دل نہیں مانتا، جس طرح ہوگا جاؤں گا۔

شوال ۱۲۹۱ھ :

رمضان بھر میں صوم کی وجہ سے دن بھر اپنے حال میں گزرتا رہتا تھا۔ نصف شب کو بھائی صاحب کے لیے دعائیں پڑھ پڑھ کر دعا مانگا کرتا تھا۔ میں نے میر نواب سے جب کبھی ان کی عیادت کو جانے کا ذکر کیا تو انھوں نے یہی کہا کہ خدا کے واسطے آپ نہ جائیے، کیونکہ انھوں نے اپنے لڑکوں کو وصیت کر دی ہے کہ میر مہر علی کو میرے جنازے پر نہ آنے دینا۔ یہ سن کر میں چپ ہو رہتا تھا۔ عید کے دن میر نواب سے معلوم ہوا کہ آج غشی بہت ہے۔ آنکھیں نہیں کھولتے ہیں اور پاؤں کا ورم بہت بڑھ گیا ہے۔

یہ سن کر ضبط کی تاب نہ رہی۔ میں چیخیں مار کر رونے لگا۔ قریب شام میں ان کے یہاں پہنچا۔ کچھ دیر دیوان خانے ہی میں بیٹھا رہا۔ مجھ کو دیکھ کر میر خورشید علی اور عسکری سہم گئے۔ مگر میں بغیر بھائی صاحب کو اطلاع کیے ہوئے پردہ کروا کر اندر گیا۔ تینوں لڑکے خوف کے مارے دوسرے دالان میں چھپ گئے۔ اور میری بہنیں بھی ڈر کے مارے ہٹ گئیں۔ میں ان کے پلنگ کے پاس گیا۔ دیکھا کہ آنکھیں بند ہیں۔ میں نے سرہانے بیٹھ کر منھ پر منھ رکھ کر بے تابانہ کچھ باتیں کیں۔ میری آواز پہچان کر خود بھی بہت روئے اور مجھے تسلی دی۔ پھر آہستہ آہستہ اپنی بیماری کا سارا حال بیان کیا۔ دس بجے رات تک میں رہا۔ اس دن سے روز ادا سہ پہر کو جاتا ہوں اور دس بجے رات کو واپس آتا ہوں۔

آج صبح کو آپ کا خط ملا۔ بھائی صاحب کی طبیعت کل بھی کسی قدر بہ حال تھی میں نے ان سے آپ کے خط کا ذکر کیا۔ آپ کی بے تابی کا حال بیان کیا اور کہا کہ حکیم صاحب نے لکھا ہے کہ سارا دہلی پور آپ کے لیے دعا کرتا ہے اور یہ کہ میں دو دن کے لیے آتا ہوں۔ جب تک قدم آنکھوں سے نہ لگاؤں گا دل کو تسکین نہ ہوگی۔ سب باتیں سن کر

فرمایا کہ تم گھر جا کے اسی وقت حکیم صاحب کو خط لکھو اور میری طرف سے لکھو کہ آپ کا جو حال ہے اس کی میرے دل کو خبر ہے۔ آپ کی دعا بھی مجھے پہنچتی ہے۔ ایسی حالت میں کہ لڑکا بھی نہیں، سید صادق بھی نہیں، آپ گھر کو اکیلا نہ چھوڑیے میں ذرا اٹھ کر بیٹھنے لگوں تو خود آپ کو بلاؤں گا کہ لطف ملاقات بھی ہو۔

مرض ان کا یہ ہے کہ اول شدت سے بخار آیا۔ دو مہینے تپ رہی اس اثنا میں تیرہ تنقیے ہوئے۔ شدت میں تخفیف ہو گئی کہ تپ رفع نہیں ہوئی۔ ذرا اٹھ کر بیٹھنے لگے تھے کہ شدید تخمہ ہوا۔ زندگی کی امید نہیں رہی۔ حکیم صاحب نے جرأت کر کے گل دیا۔ اس سے فائدہ ہوا، طبیعت سنبھل گئی۔ پھر کچھ دن تک دست آیا کیے۔ دو مرتبہ نکس ہو چکا ہے۔ جس دن سے تپ آئی اسی دن کھانا چھوٹ گیا۔ اگر کچھ منہ میں ڈالا تو متلی ہوئی۔ تین مہینے سے غذا پیٹ میں نہیں گئی۔ نہایت نقیہ ہو گئے ہیں۔ پوست و استخوان فقط باقی ہے۔ پاؤں پر ورم ہے۔ اس ورم اور نقاہت کے سوا کوئی مرض اب نہیں ہے۔ مگر نقاہت ایسی ہے کہ لاکھ مرضوں پر بھاری ہے۔ اور ورم سے بہت خوف ہے۔ غذا پر رغبت اب بھی نہیں ہے۔ حکیم کہتے ہیں کہ جگر پر ورم ہے مگر معدہ ابھی تک بچا ہوا ہے۔ مگر معدے سے ہضم کی قوت بالکل جاتی رہی ہے۔

حکیم مرزا محمد علی کے شاگرد حکیم میر باقر حسین معالج ہیں۔ ایسا علاج کر رہے ہیں کہ سب حکیم ان کے نسخے دیکھ کر تعریف کرتے ہیں۔ عرق اور شربت وغیرہ جو جو دہ لکھتے ہیں فوراً تیار ہوتا ہے۔

علاج اور دعا دونوں ایسے ہو رہے ہیں کہ اگر بادشاہ بھی بیمار ہوتا تو اس کے لیے خلقت اس طرح دعا نہ کرتی جیسے ان کے لیے شہروں شہروں ہو رہی ہے۔

نواب صاحب (امجد علی خاں) کی کچھ خبر نہیں کہ کہاں ہیں۔ کہیں سے خط بھیجیں تو معلوم ہو کہ کب آئیں گے۔

میر انیس کی وفات

میر انیس کا انتقال ۲۹ شوال ۱۲۹۱ھ مطابق ۱۰ دسمبر ۱۸۷۴ء کو ہوا۔
ان کی وفات پر بہت سے قطعات تاریخ کہے گئے۔ میر مونس کے شاگرد سید محمد ذکی الم
نے حسب ذیل قطعہ کہا؂

اے وائے خد خزاں چو بہارِ گلِ سخن	از باغِ نظم بلبلِ رنگیں کلام رفت
می بود پنج شنبہ و بست و نہم ز عید	قبل از غروب پیشِ رخ خاص و عام رفت
غسل و نماد گشت بہ شب جن قریبِ صبح	آں آفتاب در لحدِ تیرہ فام رفت
سہ سال و چند ماہ بہ ہفتاد خد فزوں	چوں آں رفیع مرتبہ و ذوالکرام رفت
از دلِ الم کشید سرِ آہ و زد ندا	سوئے ارم انیس امامِ انام رفت

(۱۲۹۱ ہجری)

اس قطعے سے معلوم ہوتا ہے کہ میر انیس کا انتقال ۲۹ شوال ۱۲۹۱ھ کو پنج شنبے کے دن غروب آفتاب سے کچھ پہلے ہوا، رات کو غسل دیا گیا اور صبح سے کچھ پہلے شبِ جمعہ کو دفن کیے گئے۔ ان کا سن ۷۳ برس اور چند مہینے کا تھا۔ یہ قطعۂ تاریخ اودھ اخبار میں ۲۹ دسمبر ۱۸۷۴ء کو شائع ہوا۔ اسی اخبار میں یکم جنوری ۱۸۷۵ء کو میر انیس کے کچھ حالات شائع ہوئے، جن سے معلوم ہوتا ہے کہ:

میر انیس نے تپ و ورم کبد کے مرض میں انتقال کیا۔ شام کے قریب انتقال ہوا اور رات کو جنازہ اٹھا۔ سب لوگوں کو خبر نہ ہو سکی پھر بھی سیکڑوں آدمی جنازے کے ساتھ تھے۔ مجلس پنجم، دو شنبے کو سید تقی صاحب کے امام باڑے میں ہوئی۔ ہزارہا آدمی شریک تھے۔ چہلم کی مجلس اسی امام باڑے میں ماہ ذی الحجہ کی نوچندی کو اول وقت قرار پائی جس میں میر نفیس نے میر انیس مغفور کا تصنیف مرثیہ پڑھا۔

اسی پرچے میں میر انیس کی یہ تین رباعیاں بھی شائع ہوئیں جو انھوں نے اپنی

بیاری میں کہی تھیں ؎

ہر آن گھٹی جاتی ہے طاقت میری — بڑھتی ہے گھڑی گھڑی نقاہت میری
آتا نہیں آب رفتہ پھر جو میں انیسؔ — اب مرگ پہ موقوف ہے صحت میری

نہ آہ دہن سے نہ فغاں نکلے گی — آواز علی علی کی ہاں نکلے گی
جس طرح نگہ چشم سے باہر ہو انیسؔ — یوں بے خبری میں تن سے جاں نکلے گی

چھٹتا ہے مقام، کوچ کرتا ہوں میں — رخصت اے زندگی کہ مرتا ہوں میں
اللہ سے لو لگی ہوئی ہے میری — اوپر کے دم اس واسطے بھرتا ہوں میں

۲ فروری ۱۸۸۷ء کے اودھ اخبار میں حضرت انیسؔ کا چہلم کے عنوان سے ایک مضمون شائع ہوا جس میں بتایا گیا کہ اس مجلس میں "علاوہ روسائے لکھنؤ کے ہزارہا آدمی شہر کے اور بیسیوں باہر کے شریک ہوئے۔ جس وقت میر نفیسؔ نے منبر پر میر انیسؔ کی یہ رباعی پڑھی ؎

دردا کہ فراق روح و تن میں ہوگا — تنہا تو ناتواں کفن میں ہوگا
اس وقت کریں گے یاد رونے والے — جس دن نہ انیسؔ انجمن میں ہوگا

"اس وقت گریہ و بکا کا شور عالم بالا تک پہنچا تھا۔"

اس مجلس میں میر نفیسؔ نے سات بند کا ایک فارسی مخمس بھی پڑھا تھا۔ اس کے تین بند یہ تھے ؎

از باغ جہاں بلبلِ بستانِ سخن رفت — در برج لحد نیّرِ تابانِ سخن رفت
ہیہات کہ سر دفتر دیوان سخن رفت — افسوس کہ شاہنشہ ایوان سخن رفت
ویرانی نظم است کہ سلطان سخن رفت

پنہاں شدہ خورشید سپہر ہمہ دانی — جاں داد شہِ کشور اعجاز بیانی
تاریک شدہ انجمنِ مرثیہ خوانی — ماتم کدہ شد خطۂ الفاظ و معانی
سلطانِ سخن، جانِ سخن، شانِ سخن رفت

ہر چند بہ ظاہر بدنش زیر زمین است — روحش بہ فلک ہم نفسِ روحِ امین است

یاد آور ہاد مرثیۂ سرورِ دین است　　خاموش نفیسؔ از الم طبع حزین است

کاں شہر سخن، بحر سخن، کان سخن رفت

میر انیسؔ کے چہلم کی مجلس ۵ رذی الحجہ ۱۲۹۱ھ کو پنج شنبے کے دن ہوئی مجلس

کا رقعہ ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔

"بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ بہ تاریخ پنجم شہر ذی الحجہ روز پنج شنبہ بعد

صبح مجلس عزائے خامس آلِ عبا علیہ التحیۃ والثنا بہ تقریب چہلم

والد ماجد فصاحت مآب، بلاغت انتساب، تاج الشعرا، انیس الغربا،

سلطان الذاکرین، ثنا خوان حضرات ائمہ معصومین علیہم السلام سید

ببر علی متخلص بہ انیسؔ مرحوم اعلی اللہ مقامہ و درجتہ فی اعلیٰ علیین قرار

یافتہ ترصد از رئیسان ذوی الاقتدار و بزرگان والاعتبار آں کہ بہ

روز معہود تشریف ارزانی داشتہ شریک محفل ماتم گشتہ ثواب اشک

عزا بہ روح مبارک آں مغفور بخشند و ایں ذرہ بے مقدار و ہیچ مدان

را سرفراز فرمایند۔　　　　فقط عبدہ الذلیل

خورشید علی نفیسؔ عفی عنہٗ

مطبوعۂ مطبع اثنا عشری، محلۂ فراش خانہ، وزیر گنج، ۱۲۹۱ھ"

حکیم سید علی کے نام میر مہر علی انسؔ کے دو اور میر خورشید علی نفیسؔ کے ایک خط

کے وہ حصّے ذیل میں نقل کیے جارہے ہیں جن سے میر انیسؔ کی وفات کے بعد کی کچھ باتوں

پر روشنی پڑتی ہے۔

الف۔ مکاتیب میر مہر علی انسؔ:

(۱) "میں ۲۰ ذی الحجہ کو سرِشام حیدر آباد پہنچا۔ تہور جنگ بہادر اسٹیشن پر موجود

تھے۔ جب ان کے مکان پر پہنچا تو دیر تک برادر صاحب مرحوم کا ذکر رہا۔ افسوس کرتے

رہے۔ آج ۲۱ تاریخ ہے۔ لوگ جوق جوق رسم تعزیت ادا کرنے کو چلے آتے ہیں۔ میر

نواب جس وقت آپ کے پاس پہنچیں تو وہ بند جو تعزیت کے کہے ہیں وہ مہین کاغذ پر

لکھ کر خط میں رکھ کر مجھ کو فوراً بھیج دیجیے گا۔ یہاں پڑھے جائیں گے۔"

(۲) "میر صاحب کی برسی کا کچھ حال معلوم نہیں　شب برات عرفے کو گزرے کچھ اکے

عزیزوں میں تقسیم کیے تھے۔ اور کچھ خبر نہیں۔ کیونکہ لڑکوں نے مجھ سے کسی طرح کی رسم و راہ اور آمد و رفت نہیں رکھی۔"

مکتوب میر خورشید علی نفیس:

"جناب والد مرحوم و مغفور کی برسی کی مجلس کی تاریخ ابھی مقرر نہیں ہوئی ہے۔ اگر چہلم کی مجلس کی طرح اہتمام ہوگا تو آپ سے عرض کروں گا ورنہ مرحوم کے ویسے کی مجلس کی اطلاع دوں گا۔"

اردو مرثیہ ابتدا سے انیسؔ تک

ایک مختصر جائزہ

اردو ادب میں ان مرثیوں کو کئی حیثیتوں سے بڑی اہمیت حاصل ہے، جن کا موضوع کربلا کا المناک واقعہ ہے۔ دنیا کی اکثر زبانوں کی طرح اردو ادب کی ابتدا بھی نظم سے ہوئی اور نظم کی سب سے قدیم صنف، جس کا اب تک پتا لگا ہے، مرثیہ ہے۔ دکن کی طرح شمالی ہند میں بھی اردو شاعری کی تاریخ مرثیے سے شروع ہوتی ہے۔ تاریخی قدامت کے علاوہ ہمارے منظوم ادب کے ذخیرے میں مرثیہ ہی وہ صنف سخن ہے جس کے لیے ہماری زبان کسی غیر ملکی ادب کی منت گزار نہیں ہے۔ یہ سچ ہے کہ اردو میں مرثیہ گوئی شروع ہونے سے کہیں پہلے عربی اور فارسی میں واقعہ کربلا کے متعلق سیکڑوں مرثیے لکھے جا چکے تھے۔ مگر اردو مرثیے کو ان سے صرف دور کا تعلق ہے۔ عربی، فارسی اور اردو مرثیوں میں اگر کوئی چیز مشترک ہے تو وہ صرف مرثیے کا بنیادی موضوع ہے اور اسی اشتراک موضوع کے باعث بعض جزئیات میں اشتراک نظر آتا ہے۔ مضامین سے قطع نظر صورت میں بھی اردو مرثیہ نہ عربی مرثیے سے ملتا ہے نہ فارسی مرثیے سے۔ عربی ادب سے تو براہ راست اردو نے کچھ لیا ہی نہیں، البتہ فارسی ادب کے ہر شعبے سے خوشہ چینی کی ہے۔ غزل ہو یا قصیدہ، مثنوی ہو یا رباعی، اردو نے یہ سب چیزیں فارسی سے سیکھی ہیں اور ان سب صنفوں میں فارسی کے قدم بہ قدم چلنے کی کوشش کی ہے۔ اپنی زبان اور اپنے ادب کی وقعت گھٹانا کس کو اچھا معلوم ہوگا، مگر اس حقیقت کا انکار کیونکر کیا جا سکتا ہے کہ شعر کی کسی صنف میں اردو، فارسی کا کسی طرح مقابلہ نہیں کر سکتی، نہ کیفیت میں نہ کمیت میں۔ لیکن اردو کے پاس مرثیہ ایک ایسی صنف

مقدمہ کتاب شاہکار انیس - مطبوعہ ۱۹۴۳ء

سخن ہے جس میں وہ فارسی کے مقابلے میں اسی تفوّق کا دعوا کر سکتی ہے جو دوسری صنفوں میں فارسی کو اردو پر حاصل ہے۔

اردو مرثیے میں وہ وسعت و جامعیت ہے کہ اس کے سامنے شاعری کی دوسری صنفیں محدود نظر آتی ہیں۔ ابتدا میں مرثیے بھی بہت مختصر ہوتے تھے۔ ان کے مضامین بھی محدود تھے اور ان کا حلقۂ اثر بھی محدود تھا۔ وہ شکل میں زیادہ تر غزل یا قصیدے سے مشابہ ہوتے تھے اور انھیں اصنافِ نظم کی طرح ان میں کلام کا تسلسل بالکل نہ ہوتا تھا یا محض برائے نام ہوتا تھا۔ ان غیر مربوط اشعار میں کربلا کے مختلف واقعات کی طرف اشارے ہوتے تھے۔ کوئی واقعہ تفصیل و تشریح کے ساتھ بیان نہیں کیا جاتا تھا۔ حسنِ تخئیل اور حسنِ بیان کی ان میں اتنی کمی تھی کہ وہ نظم کی حد سے گزر کر شاعری کی منزل تک مشکل ہی سے پہنچ سکتے تھے۔ سادگی اور خلوص ان کا خاص جوہر تھا اور یہ خصوصیتیں ان کے مقصد سے، جو صرف مصائبِ حسین پر رونا رلانا تھا، مطابقت رکھتی تھیں۔ رفتہ رفتہ مرثیے نے مسلسل کلام کی حیثیت اور مربع نظم کی صورت اختیار کرلی۔ اب اس کا دامن بھی کچھ وسیع ہوگیا۔ اس میں واقعاتِ کربلا کسی قدر تفصیل کے ساتھ بیان ہونے لگے۔ اور تخئیل کی کارفرمائیوں اور حسنِ ادا کی سحرکاریوں کو بھی جگہ ملنے لگی، یعنی مرثیے کی شعری حیثیت اب پہلے سے بہت بہتر ہوگئی۔ مرثیے کی اس ترقی میں مسکینؔ، سکندرؔ، سوداؔ اور میرؔ کا خاص حصّہ ہے۔ جب شاعری کا مرکز دہلی سے لکھنؤ کو منتقل ہوگیا تو یہاں کے حالات مرثیے کی ترقی کے لیے زیادہ سازگار تھے۔ ایک طرف مرثیے کے موضوع میں وسعت ہوئی، دوسری طرف اس کی شکل میں بھی یہ تبدیلی ہوئی کہ وہ مربع سے مخمس اور مخمس سے مسدس ہوگیا۔ مرثیے نے ترقی کی یہ منزل احسانؔ، افسردہؔ، اور گدا کی رہنمائی میں طے کی۔ لکھنوی مرثیہ گوئی کے دوسرے دور میں چار بڑے استاد جمع ہوگئے، یعنی فصیحؔ، دلگیرؔ، خلیقؔ، اور ضمیرؔ۔ ان کی کوششوں سے اردو کا خزانہ مرثیوں کی دولت سے مالامال ہوگیا؛ ایک ایک کے کلام سے کئی کئی جلدیں بھر گئیں۔ رزم کا عنصر مرثیے میں داخل ہوگیا اور مرثیہ شاعری کی ایک اہم اور بلند پایہ صنف بن گیا۔ سب سے بڑی بات یہ ہوئی کہ مرثیے کا خاکہ، مطالب اور صورت دونوں کے اعتبار سے مکمل ہوگیا۔ خاکے کی تکمیل میں میر ضمیرؔ کا حصّہ

سب سے زیادہ ہے۔ ان باکمالوں کے بعد مرزا دبیر اور میر انیس نے اس خاکے میں ایسے ایسے رنگ بھرے کہ لوگ ان کے استادوں کو بھول گئے۔ دبیر اور انیس نے الگ الگ رنگ اختیار کیا مگر یہ دونوں رنگ ضمیر کے یہاں کم و بیش موجود تھے۔ اور اگرچہ دبیر اور انیس کے کارناموں سے ضمیر کا نام دب گیا مگر اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اگر ضمیر مرثیے کو اتنی ترقی نہ دے چکے ہوتے تو نہ دبیر اس مرتبے پر فائز ہو سکتے نہ انیس۔ مرزا دبیر تو میر ضمیر کے شاگرد ہی تھے، میر انیس اگرچہ شاگرد اپنے والد میر خلیق کے تھے لیکن ان کا کلام بتاتا ہے کہ انھوں نے میر ضمیر سے بھی فیض پایا تھا۔ اس حیثیت سے مرثیے کی تاریخ میں میر ضمیر کو غیر معمولی اہمیت حاصل ہے۔

میر انیس کے زمانے تک جیسا کہ ابھی کہا جا چکا ہے، مرثیے کا نقشہ مکمل ہو چکا تھا اور بنیادیں بھری جا چکی تھیں۔ میر انیس نے انھیں بنیادوں پر ایک سر بہ فلک عمارت کھڑی کر دی۔ اب مرثیے کا پایہ اتنا بلند ہو گیا کہ اس کے سامنے شاعری کی دوسری صنفیں بے حقیقت نظر آنے لگیں۔ غزل، قصیدہ اور مثنوی یہی اردو شاعری کی خاص صنفیں ہیں۔ مگر یہ سب چند قسم کے مضمونوں میں محدود تھیں اور زندگی کے بعض مخصوص پہلوؤں کی ترجمانی کرتی تھیں۔ مرثیے نے اردو شاعری کے میدان کو اتنا وسیع کر دیا کہ اس میں ہر طرح کے مضامین کے لیے گنجائش نکل آئی، کل انسانی جذبات اس کا موضوع بن گئے اور انسان کی پوری زندگی مرثیے کے ظرف میں سما گئی۔ مولانا شبلی نے سچ کہا ہے کہ:

> "میر انیس کا کلام شاعری کے تمام اصناف کا بہتر سے بہتر نمونہ ہے۔۔۔ ان کے کلام میں شاعری کے جس قدر اصناف پائے جاتے ہیں اور کسی کے کلام میں نہیں پائے جاتے۔"

حقیقت یہ ہے کہ معنوی حیثیت سے یا تاثرات کے اعتبار سے شاعری کی جتنی قسمیں ہو سکتی ہیں، انیس کے مرثیے اُن سب پر حاوی ہیں۔ شاعری جذبات کی ترجمانی ہو یا خیالات کی، وجدان کی تعبیر ہو یا حیات کی، تخیل کی جولاں گاہ ہو یا محاکات کی، اُس کا مقصد فنی حسن کی تخلیق ہو یا انسانی اخلاق کی تکمیل، سکونِ قلب کی تحصیل ہو یا کسی پیغام کی تبلیغ، مختصر یہ کہ شاعری کی جو تعریفیں کی گئی ہیں، اس کے جو محاسن قرار دیے گئے ہیں، اس کے جو مقاصد بیان کیے گئے ہیں ان سب کے اعتبار سے انیس کے مرثیوں کا شمار اعلا درجے کی شاعری میں ہوگا۔ ایسی جامع

صنف سخن انیسی مرثیے کے سوا اور کون ہے؟ انیس نے مرثیے کی زبان کو بھی بہت وسعت دی۔ ہزاروں لفظ، محاورے اور ترکیبیں وغیرہ جو صرف اہل زبان کی بول چال میں آتے تھے، انھیں اس خوش سلیقگی سے برتا کہ وہ شاعری کی زبان کا جز بن گئے۔ اس سلسلے میں خواجہ حالی فرماتے ہیں:-

"آج کل یورپ میں شاعر کے کمال کا اندازہ اس بات سے بھی کیا جاتا ہے کہ اس نے اور شعرا سے کس قدر زیادہ الفاظ خوش سلیقگی اور شائستگی سے استعمال کیے ہیں۔ اگر ہم بھی اس کو معیار کمال قرار دیں تو بھی میر انیس کو اردو شعرا میں سب سے برتر ماننا پڑے گا۔ اگرچہ نظیر اکبرآبادی نے شاید میر انیس سے بھی زیادہ الفاظ استعمال کیے ہیں، مگر اس کی زبان کو اہل زبان کم مانتے ہیں۔ برخلاف میر انیس کے کہ ان کے ہر لفظ اور ہر محاورے کے آگے سب کو سر جھکانا پڑتا ہے۔" (شعر و شاعری)

زبان کی فصاحت اور کلام کی بلاغت کے لحاظ سے انیس کے مرثیے اردو ادب کا مایۂ ناز سرمایہ ہیں۔ مولانا شبلی فرماتے ہیں:-

"فصاحت کے مدارج میں اختلاف ہے۔ بعض الفاظ فصیح ہیں، بعض فصیح تر، بعض اس سے بھی فصیح تر۔ میر انیس کے کلام کا بڑا خاصہ یہ ہے کہ وہ ہر موقع پر فصیح سے فصیح الفاظ ڈھونڈھ کر لاتے ہیں۔"

آگے چل کر بلاغت کی بحث میں لکھتے ہیں:

"بلاغت الفاظ درحقیقت بلاغت کا ابتدائی درجہ ہے۔ اصلی اور اعلیٰ درجے کی بلاغت معانی کی بلاغت ہے، میر انیس صاحب کے کلام میں بلاغت الفاظ بھی اگرچہ انتہا درجے کی ہے، لیکن یہ ان کے کلام کا اصلی معیار نہیں۔ ان کے کلام کا اصلی جوہر معانی کی بلاغت ہے۔"

انیس نے جہاں مرثیے کے مضامین میں تنوع اور زبان میں وسعت پیدا کی ہے وہاں اس کے اثر کا دائرہ بھی بہت وسیع کر دیا ہے۔ ایک زمانہ تھا کہ مرثیہ صرف بعض مخصوص عقائد رکھنے والوں کو متاثر کر سکتا تھا۔ اب وہ ہر خیال، ہر مذہب، ہر ملت اور ہر ملک کے لوگوں کو اس طرح متاثر کر سکتا ہے جس طرح ہماری شاعری کی کوئی دوسری صنف نہیں کر سکتی۔ اگر دوسری زبانوں میں ترجمہ کر کے دوسرے ملک والوں کی نگاہوں میں اردو شاعری کی عظمت قائم کرنا ہو تو انیس کے مرثیے ہی اس مقصد کو پورا کر سکتے ہیں۔

خود ہمارے ملک میں جو ذی علم حضرات فارسی، انگریزی یا دوسری زبانوں کی شاعری کے مقابلے میں اردو شاعری کو کم مایہ سمجھتے ہیں وہ بھی انیس کے مرثیوں کو بلند پایہ شاعری تسلیم کرتے ہیں۔ مثلاً ہندوستان کے نامور مفکر اور اردو ادب کے مشہور سرپرست عالی جناب رائٹ آنریبل سر تیج بہادر سپرو اردو غزل کو محدود و مقید اردو مثنوی کے نفس مضمون کو نقش برآب و باد در ہوا، اور اردو قصیدے کو مذاق زمانہ کے خلاف اور سچی شاعری کے دائرے سے خارج سمجھتے ہیں مگر اس کے قائل ہیں کہ:

"انیس و دبیر کے مشہور عالم مرثیوں نے اردو شاعری کو ایسا مالا مال کر دیا ہے جس کی انتہا نہیں بتائی جا سکتی ہے۔"

مرثیے کی بنیاد ایک تاریخی واقعے پر قائم ہے۔ اس لیے دلوں پر جو یقین کا اثر وہ پیدا کر سکتا ہے وہ خیالی واقعات سے کسی طرح ممکن نہیں۔ پھر واقعہ بھی ایسا عظیم اور دردناک کہ دنیا کی تاریخ اس کی نظیر پیش نہیں کر سکتی۔ معرکۂ کربلا صرف حسین اور یزید کی جنگ نہیں ہے، حق و باطل، نیکی اور بدی، انسانیت اور بہیمیت کی جنگ ہے، بلکہ حق کی حمایت اور انسانیت کی حفاظت کے لیے انسان کی سب سے بڑی قربانی ہے۔ انیس نے اس قربانی کی توضیح اور اس کی قدر و قیمت کی تشریح جس خوبی سے کی ہے وہ انھیں کا حصہ ہے۔ اس مقصد کے لیے انھوں نے فلسفیانہ بحثیں کر کے صرف ترقی یافتہ دماغوں کے اطمینان کا سامان بہم نہیں پہنچایا ہے، بلکہ انسانی کرداروں کے بولتے چالتے مرقعے پیش کر کے دلوں کو اس طرح متاثر کیا ہے کہ معمولی فہم کے انسان بھی ایسی تعلیم سے بلا ارادہ اور بغیر خواہش و کوشش کے مستفید ہو سکتے ہیں۔ انسانیت کے بلند ترین معیار کو پیش نظر رکھ کر جس پر اثر اور عملی طریقے سے میر انیس کے مرثیے نیکیوں کی تعلیم دیتے ہیں، اس کی مثال کہیں اور نہیں مل سکتی۔ خواجہ حالی فرماتے ہیں "جس اعلا درجے کے اخلاق ان لوگوں نے مرثیے میں بیان کیے ہیں ان کی نظیر فارسی بلکہ عربی شاعری میں بھی ذرا مشکل سے ملے گی۔" حقیقت یہ ہے کہ شریف ترین جذبات کی تحریک میں کوئی دوسری تصنیف انیس کے مرثیوں کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ انیس کے مرثیے ہم کو ایسی فضا میں پہنچا دیتے ہیں جو تمام تر نیکی ہے اور نیکی کی طرف مائل کرنے والی، اور زندگی کے تصور میں وہ رفعت پیدا کر دیتے ہیں جو کسی اور چیز سے

ممکن نہیں۔

دنیا کے مسلّمہ معیارِ شاعری کے اعتبار سے 'ایپک' اور 'ٹریجڈی' یعنی رزمیہ شاعری اور حزنیہ تمثیل کا مرتبہ بہت بلند ہے۔ اردو ادب کا خزانہ ان بیش بہا گوہروں سے خالی تھا۔ یہ سچ ہے کہ انیس سے کچھ پہلے رزم کا بیان مرثیے میں شامل ہو چکا تھا، مگر رزمیہ شاعری کے ضروری لوازم موجود نہ تھے۔ انیس نے رزم کے بیان پر بہت زور دیا، اجتماعی اور انفرادی جنگوں کے تفصیلی منظر بڑی خوبی سے پیش کیے، اور رزمیہ شاعری کی تقریباً تمام شرطیں پوری کر دیں۔ اسی کے ساتھ ٹریجڈی یا حزنیہ تمثیل کے اہم عناصر کو بھی مرثیے میں داخل کر دیا اور اپنے مخصوص طرزِ خوانندگی سے مرثیے میں ڈرامے کی شان پیدا کر دی۔ اس طرح انیس مرثیہ 'ایپک' اور 'ٹریجڈی' کا ایسا مجموعہ بن گیا جس کی مثال شاید دنیا کی کسی اور زبان میں موجود نہیں ہے۔ اس بنا پر انیس کے مرثیوں کی تنقید کرتے وقت ایک طرف بیانیہ، رزمیہ، ڈرامائی اور جذباتی شاعری کے عالم گیر اصول پیشِ نظر رکھنا چاہیے، دوسری طرف مرثیے کی مخصوص ہیئت، مخصوص موضوع اور مخصوص مقصد کے لحاظ سے اس کی تنقید کے لیے ایک مخصوص معیار ہونا چاہیے۔ یہ مخصوص معیار انیس کے مرثیوں کے گہرے اور مسلسل مطالعے سے ہی قائم ہو سکتا ہے۔ اگر یہ معیار نظر میں ہو تو اس حقیقت میں شبہ نہ رہے کہ انیس کے مرثیے ہی ہمارے ادب کے وہ کارنامے ہیں جو دنیا کے بڑے سے بڑے شاعروں کے شاہکاروں کا مقابلہ کر سکتے ہیں اور ساری دنیا سے اردو شاعری کی عظمت تسلیم کروا سکتے ہیں۔

کلامِ انیسؔ پر مختصر تبصرہ

کسی شاعر کے کلام پر تبصرہ کرنے میں اپنے دعووں کو دلیلوں سے ثابت اور مثالوں سے واضح کرنا ضروری ہے۔ لیکن انیسؔ کے یہاں ایک ایک مثال میں کئی کئی بند اور بعض اوقات کئی کئی صفحے نقل کرنا ہوتے اور اس سے تبصرہ طویل ہو کر مقدمے کی حد سے نکل جاتا۔ مجبوراً مثالیں ترک کی گئیں۔ اب موجودہ صورت میں یہ تبصرہ گویا کہ صرف انیسؔ کی شاعری کی خوبیوں کی طرف کچھ اشارے ہیں کہ اگر ان کو ذہن میں رکھ کر انیسؔ کے کلام کا مطالعہ کیا جائے گا تو زیادہ لطف حاصل ہوگا۔

میر انیسؔ نے عام رواج کے مطابق شاعری کی ابتدا غزل سے کی۔ ان کے والد میر خلیقؔ مرثیے کی طرح غزل بھی خوب کہتے تھے۔ انھیں سے انیسؔ نے اپنی غزلوں پر اصلاح لی ہوگی۔ گمان ہوتا ہے کہ انیسؔ کی فطری قوت شاعری جس نے مرثیے میں یہ کمال دکھائے، اس نے غزل میں بھی کیا کچھ نہ کیا ہوگا۔ لیکن دو تین غزلیں اور غزلوں کے چند متفرق اشعار جو ان کی طرف منسوب کیے جاتے ہیں، اُن سے ان کا شمار اعلا درجے کے غزل گویوں میں نہیں کیا جا سکتا۔ میر انیسؔ کی شاعری کا اصل میدان مرثیہ ہے۔ اس لیے مرثیوں کے مطالعے سے ان کی شاعری کے بارے میں جو کچھ معلوم ہو سکا وہ ذیل میں نہایت اختصار کے ساتھ بیان کیا جاتا ہے۔

میر انیسؔ بڑے قادر الکلام ہیں۔ ان کو یہ قدرت حاصل ہے کہ جو نازک سے نازک خیال دل میں پیدا ہو اور لطیف سے لطیف کیفیت طبیعت پر طاری ہو اُسے لفظوں میں بیان کر دیں۔ وہ جیسا خیال ظاہر کرنا چاہتے ہیں اس کی مناسبت سے ایسے الفاظ انتخاب کرتے ہیں جو اپنی آواز، اپنے ربط باہمی اور اپنے متعلقات معنوی سے

ماخوذ از مقدمۂ روحِ انیسؔ مرتبہ سید مسعود حسن رضوی ادیب۔

اس خیال کی کامل ترجمانی کرتے ہیں اور سامع کے دل میں وہی کیفیت پیدا کر دیتے ہیں جو شاعر پیدا کرنا چاہتا ہے۔ مختلف طبقوں اور مختلف طبیعتوں کے لوگوں کے طرز کلام میں جو فرق ہوتا ہے، انیس اس کو ملحوظ رکھتے ہیں۔ ایک ہی بات کو مختلف طریقوں سے ادا کر سکتے ہیں۔ اختصار اور طول پر بھی ان کو پورا اختیار ہے۔ ان کے پاس لفظوں کا اتنا بڑا خزانہ موجود ہے جس سے زائد شاید ہی کسی اور شاعر کو نصیب ہوا ہو۔ مترادفات کے نازک فرقوں کا بھی بہت لحاظ رکھتے ہیں۔ وہ ایک ہی واقعے کو جزئیات و تفصیلات کے اختلاف کے ساتھ بیسیوں طرح پر بیان کرتے ہیں اور ہر طرح وہ واقعہ مطابق فطرت رہتا ہے۔ نہ اس کی دلچسپی کم ہونے پاتی ہے نہ نظم کا زور گھٹنے پاتا ہے۔ یہ ایسی خصوصیت ہے جو شاید دنیا کے کسی اور شاعر کے حصے میں نہیں آئی۔ کلام کا اثر انیس کے ارادے کا تابع ہے اور یہ بھی وہ خوبی ہے جو بہترین شاعروں کے سوا کسی میں نہیں پائی جاتی۔

واقعہ نگاری میں انیس کو کمال حاصل ہے۔ مورخانہ واقعہ نگاری اور شاعرانہ واقعہ نگاری میں ایک خاص فرق ہے۔ اگر ایک واقعے کے تمام جزئیات کا علم ہو تو اس کو نظم کر دینے کے لیے صرف طبیعت کی موزونی کافی ہے اور اس کا نظم کر دینا شاعری نہیں ہے۔ کسی واقعے کے اجمالی علم کی بنیاد پر اس کے تفصیلات کا تخیل سے پیدا کرنا شاعری ہے۔ لیکن شاعرانہ واقعہ نگاری کے لیے بھی یہ لازم ہے کہ واقعات شاعر کے قلم کی جنبشوں کے تابع نہ معلوم ہوں، بلکہ قدرتی اسباب کا نتیجہ معلوم ہوں۔ اس کے لیے شاعر کو ایسے اسباب مہیا کرنا پڑتے ہیں کہ جو کچھ وہ واقع کرانا چاہتا ہے اس کا وقوع ان اسباب کا فطری نتیجہ ہوتا ہو۔ حقیقت میں یہ بڑا مشکل کام ہے لیکن انیس کو اس میں بڑی مہارت ہے۔

ہر واقعے میں بہت سے جزئیات ہوتے ہیں۔ ان میں سے بعض میں انتقال ذہن کی اتنی قوت ہوتی ہے کہ صرف انھیں کے بیان سے واقعے کا پورا نقشہ آنکھوں میں پھر جاتا ہے۔ انیس اکثر انھیں جزئیات کو منتخب کر لیتے ہیں اور واقعات کے اجمالی بیان میں تفصیلی بیان سے زیادہ دلچسپی اور اثر پیدا کر دیتے ہیں۔ اسی طرح ایک واقعے کے بعض جزئیات میں دلوں کو متاثر کرنے کی قوت اس کے دوسرے جزئیات

سے زیادہ ہوتی ہے۔ انیس بالعموم انھیں موثر جزئیات کو نمایاں کر دیتے ہیں۔

منظر نگاری کا کمال بالعموم یہ سمجھا جاتا ہے کہ منظر کی لفظی تصویر اصلی منظر سے اس قدر مطابق ہو کہ تصویر سے اصل کا لطف حاصل ہو۔ لیکن حقیقت میں مناظر کی تصویروں کو بالکل اصل کے مطابق کر دکھانا شاعر کا کمال نہیں ہے۔ باکمال شاعر اپنی قوت تخئیل سے قدرتی منظروں میں ایسا تغیر کر دیتا ہے کہ وہ منظر بالکل فطری تو نہیں رہتا مگر خلاف فطرت بھی نہیں معلوم ہوتا، اور منظر کا بیان اصل منظر سے زیادہ دل کش اور موثر ہو جاتا ہے۔ انیس نے صبح کی رونق، شام کا سناٹا، بہار کا جوش، گرمی کی شدت وغیرہ اکثر اس طرح بیان کی ہے کہ ان کے بیان میں شاعرانہ منظر نگاری کا یہ کمال موجود ہے۔

جذبات کے اظہار میں بھی انیس کو بڑی قدرت حاصل ہے۔ جذبات کے مختلف مدارج ہوتے ہیں۔ کوئی محل انتہا کی خوشی، غم، حیرت، غصے وغیرہ کا ہوتا ہے، کسی محل پر یہی جذبات بالکل خفیف سے پیدا ہوتے ہیں۔ انتہائی شدت اور انتہائی خفت کے درمیان بے شمار درجے ہوتے ہیں۔ جذبات کے ان مدارج کو ملحوظ رکھنا اور ان کا اظہار کر لینا انیس کا وہ امتیاز ہے جس میں شاید ہی کوئی اردو کا دوسرا شاعر ان کا شریک ہو سکے۔ جن حالات میں جو جذبات پیدا ہونا چاہیے۔ اور جس حد تک پیدا ہونا چاہیے، انیس انھیں جذبات کو اسی حد کے اندر دکھاتے ہیں۔ انھوں نے مختلف مرثیوں میں ایک ہی موقع پر ایک ہی شخص کے جذبات مختلف بلکہ متضاد دکھائے ہیں۔ مگر ہر جگہ حالات میں کچھ ایسا ضمنی تغیر کر دیا ہے کہ جذبات فطرت کے مطابق ہی رہے۔

بعض وقت کئی طرح کے جذبات کے مخلوط ہونے سے ایک خاص کیفیت انسان کے دل میں طاری ہو جاتی ہے۔ بعض اوقات انسان کے دل میں دو طرح کے جذبات یکے بعد دیگرے کچھ دیر تک برابر پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ اسی طرح نہ معلوم کتنی عجیب عجیب کیفیتیں انسان کے دل میں گزرتی رہتی ہے۔ انیس ایسے نازک موقعوں پر جذبات کی فطری حالت کو محسوس کر سکتے ہیں اور ان کے اظہار کے لیے طرح طرح کے موثر پیرائے اختیار کرتے ہیں۔ وہ جذبات کا بیان اکثر صراحت سے نہیں کرتے بلکہ ایسے

علامات کا ذکر کردیتے ہیں جن سے وہ جذبات خود بخود سمجھ میں آجاتے ہیں۔

سیرت نگاری تو انیس سے پہلے گویا اردو میں تھی ہی نہیں۔ بعض قصّوں اور مثنویوں میں اشخاص کی سیرت ایک حد تک متعین کرکے دکھائی گئی ہے۔ لیکن سیرت نگاری کا وہ کمال جو انیس کے یہاں ہے اس کا ایک شائبہ بھی میر حسن کے سوا شاید ان کے کسی پیش رو کے یہاں نہیں ملتا۔ انیس کے مرثیوں میں جن لوگوں کا ذکر آتا ہو ان میں سے بعض کے کارناموں کو واقعہ کربلا میں خاص اہمیت حاصل ہے۔ ان لوگوں کی سیرتیں انیس نے تفصیل کے ساتھ دکھائی ہیں اور ان کے مخصوص امتیازات اور خاص خصوصیات ہر جگہ اور ہر حالت میں نمایاں رکھے ہیں۔ باقی لوگ جن کے کردار کو واقعۂ کربلا میں کوئی امتیازی حیثیت حاصل نہیں ہے، ان میں انیس نے عام انسانی خوبیاں حدِ کمال تک دکھائی ہیں لیکن ان میں ایسے خصوصیات نہیں دکھائے ہیں جو ایک کی سیرت کو دوسرے کی سیرت سے ممتاز کرسکیں۔ یعنی انیس کے یہاں چند متحرک شخصیں ہیں اور باقی محض نام ہیں۔ امام حسین کی سیرت دکھلانے میں انیس نے بالخصوص بڑا کمال کیا ہے اور ملکیت اور بشریت کو کچھ اس تناسب سے سمو دیا ہے کہ وہ مقدس سیرت جس طرح دنیا کی تاریخ میں عدیم المثال تھی اسی طرح اردو شاعری کی دنیا میں بھی بے نظیر ہوگئی۔

انیس نے اشخاص مرثیہ کی جو سیرت دکھائی ہے وہ نہ خالص عربی ہے نہ بالکل ہندوستانی بلکہ دونوں کا ایک ایسا مجموعہ ہے جس میں ہندوستانیت عربیت سے زیادہ نمایاں ہے۔ بعض لوگ شاید اس کو قابل اعتراض سمجھیں۔ لیکن اگر انیس یہ نہ کرتے تو نہ واقعۂ کربلا کو خاص و عام میں یہ عظمت اور اہمیت حاصل ہوتی، نہ امام حسین اور ان کے رفیقوں کی محبت اس طرح ہر دل میں گھر کرتی، نہ اہل ہند ان کو قابل تقلید نمونہ قرار دے سکتے، اور نہ ان کے مصائب کو اپنی ذاتی مصیبتوں کی طرح محسوس کرسکتے۔ اور اگر یہ نہ ہوتا تو انیس کا مقصد ہی فوت ہوجاتا۔

اخلاقی شاعری کے اعتبار سے انیس کے مرثیوں کا پایہ بہت بلند ہے۔ ان کے تمام کلام میں بلند اخلاقی کی ایک لہر دوڑی ہوئی ہے۔ جن اخلاق فاضلہ کی تعلیم انیس کے مرثیوں سے ہوتی ہے وہ اخلاق و نصائح کی کسی کتاب سے یا وعظ و پند

کے ذریعے سے ممکن نہیں۔ نفس انسانی کی انتہائی شرافت کے نقشے جن موثر پیرایوں میں کھینچے ہیں ان کا جواب ممکن نہیں اور ان کو انتہائی رذالت کی تصویروں کے مقابلے میں رکھ کر ان کے اثر کو اور بھی قوی کر دیا ہے۔ حسین اور رفیقان حسین کی سیرتوں میں اخلاق حسنہ کی انتہا اس حسن سے دکھائی ہے اور ان کے اعمال و افعال کے ذریعے سے دکھائی ہے کہ وہ حسن اخلاق کے محض خیالی معیار ہو کر نہیں رہ گئے بلکہ قابل تقلید نمونے بن گئے ہیں۔ لہٰذا اخلاق کی انتہا کے ساتھ ساتھ ان میں وہ کمزوریاں بھی دکھائی ہیں جو لازمۂ بشریت ہیں لیکن بداخلاقی کی حد سے بہت دور ہیں۔ یہی کمزوریاں ان اخلاق کے پتلوں کو ہم سے قریب تر کر کے ہماری محبت اور ہمدردی کا رُخ ان کی طرف موڑ دیتی ہیں۔

کبھی کبھی میر انیس نے اخلاق کی تعلیم براہ راست پند و موعظت کے ذریعے سے بھی دی ہے۔ لیکن بالعموم وہ ایسا نہیں کرتے بلکہ بلند اخلاق کے نہایت دل کش نمونے پیش کر کے ہم کو ان کی تقلید پر راغب کرتے ہیں۔ اور اس طرح کی بالواسطہ اخلاقی تعلیم سے ان کے مرثیے کا کوئی مقام خالی نہیں ہوتا۔ اسی اخلاقی بلندی کا ایک نتیجہ یہ بھی ہے کہ انیس کے کلام میں وقار اور تمکین کی ایک خاص شان نظر آتی ہے۔ ان کے بیانات میں اور ان کے ہیرو کے افعال و اقوال میں کہیں ابتذال اور چھچھوراپن نہیں پایا جاتا۔

سلاست، روانی، شگفتگی اور فصاحت کے دوسرے لوازم انیس کے کلام میں اس قدر نمایاں ہیں کہ ان کو بیان کرنے اور ان کی طرف متوجہ کرنے کی کوئی خاص ضرورت نہیں معلوم ہوتی۔ جو صحیح المذاق شخص انیس کا ایک مرثیہ بھی پڑھ لے گا وہ کلام انیس کے اس وصف کو خود سمجھ لے گا اور اس طرح سمجھ لے گا جس طرح کسی دوسرے کے سمجھانے سے ہرگز نہ سمجھ سکتا۔ انیس کے کلام میں فصاحت اس درجہ نمایاں ہے کہ ان کا کوئی مخالف بھی اب تک اس کا انکار کرنے کی جرأت نہیں کر سکا۔ وہ دقیق اور نازک خیالات کو آسان لفظوں میں اس طرح ادا کر دیتے ہیں کہ ظاہر بیں نگاہیں مضمون کی جدّت اور باریکی تک نہیں پہنچتیں اور اس غلط فہمی میں مبتلا ہو جاتی ہیں کہ انیس کے کلام کی خوبی صرف اس کی فصاحت ہے۔

فصاحت کلام کے لیے یہ ضروری ہے کہ الفاظ کی ترتیب قواعد اور محاورے

کے مطابق ہو۔ نظم میں وزن، قافیے اور ردیف کی پابندیوں کی وجہ سے ایسی ترتیب کا قائم رہنا نہایت مشکل ہے۔ لیکن انیسؔ نے اس مشکل کام کو بہتر سے بہتر طور پر انجام دیا ہے۔ ان کے کلام کا زیادہ حصہ ایسا ہے جس میں لفظوں کی ترتیب بالکل نثر کی سی ہے۔ جہاں ضروریاتِ نظم نے ترتیب بدلنے پر مجبور کیا ہے وہاں بھی ایسی تبدیلی ہوئی ہے جو ناگوار نہیں معلوم ہوتی بلکہ اکثر اس تبدیلی کا احساس بھی نہیں ہوتا۔

حسنِ بیان کے سلسلے میں صنعتوں پر بھی ایک نظر کرنا ضروری ہے۔ بعض لوگوں نے صنعتوں کے استعمال میں ایسی بدسلیقگی اور اتنی بے اعتدالی برتی کہ اب طبیعتیں ان سے ابا کرنے لگی ہیں۔ لیکن کسی شے کے غلط استعمال سے نفسِ شے میں کوئی خرابی نہیں آسکتی۔ اس میں شک نہیں کہ اگر امتیاز اور سلیقے کے ساتھ بعض صنعتیں استعمال کی جائیں تو کلام کے حسن میں اچھا خاصا اضافہ ہو سکتا ہے۔ میر انیسؔ صنائع کو اس طرح استعمال کرتے ہیں کہ فصاحت کے شرائط اور بلاغت کے لوازم میں کوئی خلل نہیں پڑتا۔ وہ صنعت کے لیے کلام کے کسی عیب کو گوارا نہیں کر لیتے۔ بعض مفروضہ صنعتیں جن کو حقیقتاً کلام کے حسن میں کچھ دخل نہیں وہ ان کے یہاں نہ ہونے کے برابر ہیں۔ لیکن جن صنعتوں سے کلام کا حسن بڑھتا ہے ان کو انھوں نے بہت کثرت سے استعمال کیا ہے مگر وہ صنعتوں کو اتنا ابھرنے نہیں دیتے کہ وہ سامع کے ذہن کو معنی سے ہٹا کر اپنی طرف متوجہ کر لیں۔

انیسؔ کے زمانے میں رعایتِ لفظی کے استعمال کا بڑا زور تھا۔ یہاں تک کہ بعض لوگ اسی کو اصل شاعری سمجھنے لگے تھے اور اس لیے اس کے استعمال میں حدِ مناسب سے بہت تجاوز کر گئے تھے۔ انیسؔ نے بھی اپنے ماحول سے متاثر ہو کر اس صنعت کو خوب برتا ہے، مگر اس طرح کہ نہ اس کی وجہ سے بیان میں الجھاؤ اور محاورے میں خلل پڑتا ہے، نہ بے جا تکلف اور بے لطف تصنع ظاہر ہوتا ہے اور نہ ذہن کسی غیر متعلق مفہوم کی طرف منتقل ہونے پاتا ہے۔ ان کی مشاقی کے زمانے کے کلام میں ایسی مثالیں بہت ہی کم ملتی ہیں جن میں یہ صنعت بے اعتدالی سے استعمال کی گئی ہو۔ اور جو مثالیں ایسی ملتی بھی ہیں ان میں اکثر بے اعتدالی کے جواز کی کوئی صورت موجود ہوتی ہے۔

انیسؔ کے یہاں اکثر ایک ایک مصرعے میں کئی کئی صنعتیں موجود ہیں اور بعض جگہ ایک ایک صنعت کے اندر کئی کئی صنعتیں بھری ہوئی ہیں۔ کچھ صنعتیں ایسی بھی

ہیں جو انھیں کی طبیعت نے ایجاد کی ہیں اور جن کا کوئی نام اب تک مقرر نہیں ہے۔ اس میں شک نہیں کہ صنعتوں کے استعمال میں بھی میر انیس اپنا جواب نہیں رکھتے۔ لیکن ان کی شاعری کا مرتبہ اس سے بلند تر ہے کہ صنائع کو اس کا طرۂ امتیاز قرار دیں۔ ان کا اصل کمال تو اس سادگی میں ظاہر ہوتا ہے جس پر ہزار صنعتیں نثار ہیں۔

انیس کا کلام جتنا فصیح ہے اتنا ہی بلیغ بھی ہے۔ عام طور پر بلاغت کا ایک غلط مفہوم مشہور ہو گیا ہے جس کی بنا پر لوگ اس کلام کو بلیغ سمجھنے لگے ہیں جس میں مشکل الفاظ، دقیق ترکیبیں، دور از کار استعارے، بعید الفہم تشبیہیں وغیرہ ہوں بعض لوگ اس کلام کو بلیغ سمجھتے ہیں جس میں لفظ کم اور معنی زیادہ ہوں۔ لیکن حقیقت میں بلاغت یہ ہے کہ کلام مقتضائے مقام کے موافق ہو۔ سلاست و اشکال، سادگی و رنگینی، طول و اختصار سب کچھ بلاغت کے اندر آجاتا ہے، بہ شرطیکہ مناسب محل پر ہو۔ یہ بات بھی بلاغت میں داخل ہے کہ کلام کا ایک جز دوسرے جز کا نقیض نہ ہو۔ انیس کے کلام میں بلاغت کے یہ تمام لوازم موجود ہیں وہ جس موقعے پر جو کام جس شخص سے لیتے ہیں اور جو بات جس سے کہلواتے ہیں وہ اسی کے لیے موزوں ہوتی ہے۔ یہ صفت انیس کے کلام میں اس قدر نمایاں ہے کہ لکھنؤ کے جہلا کی زبان پر بھی یہ جملہ جاری ہے کہ "میر انیس کے یہاں حفظ مراتب بہت ہوتا ہے"۔

گفتگو اور مکالمے کے لکھنے میں بھی کوئی شاعر انیس کا مقابل نہیں ہو سکتا۔ یوں تو گفتگو کا نظم میں ہونا ہی خلاف فطرت ہے، لیکن نظم میں اور بالخصوص مسدس میں جس قدر فطرت کی مطابقت ممکن ہے اتنی انیس کے یہاں موجود ہے۔ اگر لفظوں کی ترتیب میں ذرا سا فرق کر کے انیس کے مکالموں کو نثر کر دیں تو معلوم ہو کہ نظم کا کیا ذکر نثر میں بھی ایسا مکالمہ لکھنے والا اردو میں اب تک کوئی پیدا نہیں ہوا۔ انیس جب دو شخصوں کی گفتگو لکھتے ہیں تو الفاظ، طرز کلام اور لب و لہجے میں متکلم اور مخاطب دونوں کی عمر، صنف، سیرت، حیثیت، وقتی قلبی کیفیت، گفتگو کے موقعے اور ان کے باہمی تعلقات کا لحاظ رکھتے ہیں۔ امام حسین اور ان کے اقربا کی گفتگو میں جو فصاحت، جو تہذیب، جو متانت انیس نے دکھائی ہے اس کا جواب کہیں نہیں مل سکتا۔ گفتگو اور مکالمے کا لکھنا بہ ظاہر جتنا آسان معلوم ہوتا ہے حقیقت میں اتنا ہی مشکل ہے۔

ناولوں میں نثر کے مکالمے پڑھیے تو اکثر یہ معلوم ہوتا ہے کہ دو آدمی بے تکلفی کے ساتھ فطری انداز میں گفتگو نہیں کر رہے ہیں، بلکہ لکھے ہوئے سوال و جواب پڑھ کر سنا رہے ہیں۔ تحریر میں تقریر کی بے ساختگی پیدا کرنا بڑا مشکل کام ہے۔ لیکن انیس نے نظم میں بعض مکالمے اور گفتگو میں ایسی لکھ دی ہیں کہ ان کو پڑھتے وقت یہ بات خود بہ خود نظر انداز ہو جاتی ہے کہ وہ نظم میں ہیں۔

ترتیب اور تسلسل بھی انیس کے کلام کی ایک خاص خوبی ہے۔ یہ صفت ان کے کلام میں اس قدر نمایاں ہے کہ ہر شخص اس کو خود محسوس کر سکتا ہے۔ اگر انیس کے متعدد مرثیے پڑھنے کے بعد کسی اور مرثیہ گو کا کلام پڑھا جائے تو اس صفت کا احساس شدت کے ساتھ ہو جاتا ہے۔ انیس جب ایک بات ختم کر کے دوسری بات شروع کرتے ہیں یا ایک مقام کے بعد دوسرا مقام شروع کرتے ہیں تو دونوں کو اس حسن سے ملاتے ہیں کہ جوڑ معلوم نہیں ہوتا۔ بات میں بات نکلتی چلی آتی ہے۔ وہ جملے میں لفظوں کو اور عبارت میں جملوں کو اس ترتیب سے رکھتے ہیں کہ ایک بات سن کر اس کے بعد آنے والی بات کے لیے ذہن خود تیار ہو جاتا ہے اور اس کو کسی خلاف توقع بات سے اچانک سامنا نہیں کرنا پڑتا۔ یہ نہیں ہوتا کہ کوئی بات ناگہانی طور پر سامنے آ کر ذہن کو متوحش کر دے۔ اس خوبی کی بنا پر میر انیس کا کلام پڑھتے وقت دماغ کو راحت اور دل کو لذت ملتی ہے۔

انیس کے کلام کا ایک خاص وصف اعتدال ہے جس کا اظہار تین طرح پر ہوا کرتا ہے۔

(۱) لفظ و معنی کی مناسبت میں۔ یعنی وہ دس سیر معنی کے لیے دس من کا لفظ نہیں رکھ دیتے۔

(۲) جذبات کے اظہار میں یعنی وہ مقتضیات مقام کے لحاظ سے جذبات میں شدّت اور خفت دکھاتے ہیں۔ ان کے یہاں جذبات میں جاہلانہ زور و شور نہیں ہوتا بلکہ مہذّبانہ اور شریفانہ اعتدال ہوتا ہے۔

(۳) تعریف و مذمت میں۔ یعنی وہ ہر خوش نما درخت کو طوبیٰ سے، ہر پُر فضا باغ کو بہشت سے، اور ہر حسین کو یوسف سے بہتر نہیں کہہ دیتے۔ اسی طرح مذمت میں بھی اعتدال ملحوظ رکھتے ہیں۔

بیان رزم حقیقت میں واقعہ نگاری اور منظر نگاری کے تحت میں آتا ہے، لیکن چوں کہ یہ خاص بیان انیس کے یہاں کثرت سے ملتا ہے، اور اکثر مرثیوں میں جنگ کے منظر بڑی تفصیل کے ساتھ دکھائے گئے ہیں، اس لیے اس باب میں بھی کچھ لکھنا ضروری ہے۔ انیس جنگ کا نقشہ خوب کھینچتے ہیں۔ پہلوانوں کی ہیبت، ان کی آمد کی دھوم دھام، رجز کا زور و شور اور حریفوں کے داؤں پیچ خوب دکھاتے ہیں اور اس سلسلے میں شمشیر زنی، نیزہ بازی، تیر اندازی اور شہ سواری کی اصطلاحوں سے اکثر کام لیتے ہیں۔ حرب و ضرب کے ہنگاموں کی ایسی تصویر کھینچتے ہیں کہ میدان جنگ کا نقشہ آنکھوں میں پھر جاتا ہے۔ عام ہنگامۂ جنگ کے علاوہ دو حریفوں کا مقابلہ اور ان کی گھاتیں اور چوٹیں اس تفصیل سے بیان کرتے ہیں کہ لڑائی کا ساں سامنے آجاتا ہے۔ اس خصوص میں بھی انیس کا کوئی نظیر دکھائی نہیں دیتا۔

انیس کے زمانے میں تلوار اور گھوڑے کی تعریف مرثیے کا ایک جز بن گئی تھی۔ تلوار کی تعریف کے ضمن میں بالعموم شمشیر زنی کے کمالات دکھائے جاتے ہیں جو حقیقت میں تلوار کی نہیں بلکہ تلوار چلانے والے کی تعریف ہوتی ہے۔ انیس نے بھی زیادہ تر یہی کیا ہے لیکن خود تلوار کی تعریف بھی جا بہ جا کی ہے۔ گھوڑے کی خوب صورتی، خوش خرامی، سبک روی اور تیز گامی کا بیان بھی خوب خوب کیا ہے۔ یہ بیان زیادہ تر مبالغہ آمیز ہوتا ہے۔ لیکن کہیں کہیں گھوڑے کے حقیقی اوصاف بھی نہایت خوبی سے بیان کیے ہیں۔ تلوار اور گھوڑے کی تعریف انیس نے جس جس طرح لکھی ہے اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ وہ شمشیر زنی اور شہ سواری کی اصطلاحوں پر عبور رکھنے کے علاوہ ان فنون سے بھی واقف تھے۔

پرانے زمانے میں دستور تھا کہ مقابل فوجوں میں سے ایک ایک پہلوان نکل کر مقابلہ کرتا تھا۔ مقابلے سے پہلے ہر پہلوان کچھ فخریہ اشعار پڑھتا تھا جن میں اپنی نسبی فضیلت، اپنے اور اپنے اسلاف کے کارنامے، اپنی بہادری اور فن جنگ کی مہارت وغیرہ کا ذکر شد و مد کے ساتھ کیا جاتا تھا۔ ان فخریہ اشعار کو 'رجز' کہتے ہیں۔ انیس نے 'رجز' بڑے زور شور کے لکھے ہیں اور اس بات کا خاص طور پر لحاظ رکھا ہے کہ ہر شخص کا رجز اس کے حسب حال ہو۔ اسی بنا پر امام حسین کے 'رجز' میں پہلوانی اور زور آوری کا ذکر کم، اور دوسرے شرفوں اور فضیلتوں کا ذکر زیادہ ہوتا ہے۔ اگر کہیں طاقت وری اور

جنگ آزمائی کا ذکر ہوتا بھی ہے تو ایک خاص متانت اور وقار کے ساتھ جو امام کے 'رجز' کو محض ماہر جنگ سپاہی کے 'رجز' سے ممتاز کر دیتا ہے۔

انیسؔ نے 'رخصت' پر اکثر بہت زور دیا ہے اور بیشتر جذبات نگاری کا کمال دکھایا ہے۔ حضرت علی اکبر کی رخصت بالخصوص بڑے اہتمام سے اور نئے نئے عنوانوں سے لکھی ہے۔ یہ انیسؔ کا کمال ہے کہ ایک ہی بات کو مختلف پیرایوں میں بیان کیا اور ہر جگہ فطرت سے مطابقت قائم رہی۔ مرثیے کا یہ حصہ بالعموم بہت دردناک ہوتا ہے۔

مرثیے کا سب سے زیادہ دردناک حصہ بین ہے۔ بلکہ سچ پوچھیے تو بین ہی اصل مرثیہ ہے۔ میر انیسؔ بالعموم مختصر بین لکھتے ہیں۔ طولانی بین بہت کم لکھے ہیں۔ وہ سخت بین لکھنا پسند نہیں کرتے، کیوں کہ ان کے مخاطب صحیح عوام نہیں بلکہ لطیف جذبات کے لوگ ہیں، جن کے دل پر بے محل نالے اتنا اثر نہیں کرتے جتنی با محل ایک آہ۔ جو لوگ لطیف جذبات رکھتے ہیں ان کو سخت مظالم کے بیان سے تنفر اور سخت بین سے تنغص ہوتا ہے۔ لیکن جہاں جہاں اُن کے نازک جذبات کو ٹھیس لگتی ہے وہاں ان کے آنسو بے ساختہ نکل آتے ہیں۔ میر انیسؔ اس حقیقت کو خوب سمجھتے تھے۔ اُن کے یہاں بین کے علاوہ مرثیے کے دوسرے مقامات بھی اکثر بہت دردناک اور نہایت پُر اثر ہوتے ہیں۔ رخصت بالخصوص ایسی ہوتی ہے کہ پتھر کا دل پانی ہو جائے۔

آج کل بعض لوگ قافیے اور ردیف کو بے ضرورت قیدیں سمجھتے ہیں اور خیال کرتے ہیں کہ ان سے کلام غیر فطری ہو جاتا ہے۔ لیکن وزن جو شعر کے لیے ضروری سمجھا جاتا ہے اُسے بھی تو غیر فطری کہہ سکتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ جس طرح وزن سے کلام کا حسن اور اثر بڑھتا ہے اسی طرح قافیے اور ردیف سے بھی۔ اگر کوئی شخص قافیے اور ردیف کی قیدوں کے ساتھ اظہار مطالب میں عاجز ہو تو اس کو بے شک ان پابندیوں سے آزاد ہی رہنا چاہیے۔ لیکن جو قادر الکلام قافیے اور ردیف کا التزام اس طرح کر سکتے ہیں کہ بیان میں آمد، بے ساختگی اور فطری پن باقی رہتا ہے، ان کا کلام سحر بن جاتا ہے۔ اس نکتے کو سمجھنا ہو تو میر انیسؔ کا کلام غور سے پڑھیے۔ انیسؔ کو قافیے اور ردیف کی پابندی میں ذرا بھی دقت نہیں ہوتی۔ وہ نہایت مشکل قافیے اور ردیفیں اس حسن اور اس آسانی سے نظم کر دیتے ہیں کہ پڑھنے والوں کو اُن کے مشکل ہونے کا خیال بھی نہیں ہوتا۔

انیس کے کلام کی چند خصوصیتیں جو نہایت مختصر طور پر علاحدہ علاحدہ بیان کی گئی ہیں ظاہر ہے کہ یہ الگ الگ نہیں پائی جاتیں بلکہ ان کا کلام ان تمام خوبیوں کا مجموعہ ہے، اور ان سب کے اجتماع سے کلام میں جو حسن اور اثر پیدا ہوتا ہے اس سے صرف دل لطف اندوز ہو سکتا ہے، زبان اس کے بیان پر قادر نہیں۔

آخر میں اس حقیقت کا اظہار ضروری معلوم ہوتا ہے کہ کلامِ انیس کے جو محاسن اوپر بیان کیے گئے ہیں ان میں انیس کا صرف اعلا درجے کا کلام پیشِ نظر رکھا گیا ہے۔ کسی شاعر کے بارے میں یہ توقع نہیں کی جا سکتی کہ اس کے ابتدائی کلام میں بھی وہ سب خوبیاں موجود ہوں جو بعد کو اس کا طرۂ امتیاز قرار پائیں۔ یہ توقع بھی بے جا ہوگی کہ کسی ماہر صناع کے تمام مصنوعات یکساں طور پر اس کے کمالِ صنعت کے آئینہ دار ہوں اس سے لغزشیں بھی ہوں گی، فروگذاشتیں بھی ہوں گی، مگر اس کے شاہکاروں میں ان کی حیثیت وہی ہوگی جو چاند میں داغوں کی ہے۔

میر انیس کے کلام میں صنعتوں کا استعمال

صنعتوں کا استعمال بہ ذات خود شاعری نہیں ہے لیکن شاعر اگر ان کے استعمال میں سلیقے اور امتیاز سے کام لے تو کلام کے حُسن اور اثر میں اضافہ کرسکتا ہے۔ بعض نام نہاد شاعروں نے صنعتوں کے استعمال کو شاعری یا کلام کا مقصدِ اصلی سمجھ لیا۔ ان کی اس غلط فہمی نے ان کے کلام کو شاعری کی حد سے نکال کر کبھی کبھی مہملیت کے درجے تک پہنچا دیا۔ یوں تو جو صنعت بھی بدسلیقگی اور بے امتیازی سے صَرف کی جائے گی وہی کلام کو سنوارنے کی جگہ اس کے دامن پر دھبّہ بن جائے گی مگر جس صنعت نے ایک زمانے میں اُردو کے بعض شاعروں کی تخیّل کا رُخ ضلع جگت کی طرف موڑ دیا اور جس کی بہ دولت بعض شاعر لفظوں کی بھول بھلیّاں میں پھنس کر معنی کا راستہ بھول گئے وہ رعایت لفظی ہے جس کو علم بدیع کی اصطلاح میں صنعت مراعاۃ النظیر کہتے ہیں۔ بعض لوگوں نے یہ حال دیکھ کر اس کے متعلق ناجائز ہونے کا فتویٰ دے دیا۔ لیکن یہ ان کی خطائے اجتہادی ہے یہی صنعت اگر چند شرطوں کے ساتھ استعمال کی جائے تو کلام کا زیور بن جاتی ہے۔ وہ شرطیں یہ ہیں کہ رعایت لفظی کلام کا مقصد نہ قرار دی جائے، اس کی وجہ سے بیان میں الجھاؤ اور محاورے میں خلل نہ پڑے، بے جا تکلّف اور بے لطف تصنّع ظاہر نہ ہو اور ذہن کسی غیر متعلق یا خلاف محل مفہوم کی طرف منتقل نہ ہونے پائے۔ ان شرطوں کی پابندی کرنا اور نہ کرنا رعایت لفظی کے حُسن و قبح کا سبب بن جاتا ہے۔ حسن و قبح کے اعتبار سے اس صنعت کو تین قسموں میں تقسیم کرسکتے ہیں۔ ایک وہ جس سے کلام میں کوئی خوبی پیدا ہو جائے، دوسری وہ جس سے کلام میں کوئی خرابی واقع ہو جائے، تیسری وہ جس سے نہ کوئی خوبی پیدا ہو نہ

مطبوعہ ماہ نامہ زمانہ۔ کان پور۔ مئی ۱۹۲۶ء

خرابی:- پہلی کو مستحسن، دوسری کو ناجائز اور تیسری کو جائز کہہ سکتے ہیں۔ ذیل میں ان تینوں قسموں کی مثالیں دی جاتی ہیں:-

مستحسن:

از صاحب حرم چہ توقع کنند باز
آں ناکساں کہ دست براہل حرم زنند
— مقبل

چوٹا ادب سے پائے امام انام کو
خم ہو گئے تمام نمازی سلام کو
— انیس

جائز:

پانی میں تھے نہنگ مگر تھی لبوں پہ جاں
دریا میں نہنگوں کے جگر کانپ رہے ہیں
— "

پوشیدہ ہیں پانی میں مگر کانپ رہے ہیں
— دبیر

ناجائز:

شامی کباب تھے یہ ہوئی جب شرر فشاں
اہل تتار بن کے ہرن رن سے تھے رواں
— دبیر

مرغ دل کو توڑے گی بلی ترے دروانے کی
رخت تن کو کترے گا چوہا تمھاری ناک کا
— امانت

مستحسن اور ناجائز رعایتوں کے کئی مختلف درجے ہوتے ہیں۔ ناجائز رعایت کی جو مثالیں ابھی دی گئی ہیں ان میں اس قدر فرق ہے کہ پہلی کو اگر مکروہ سمجھیں تو دوسری کو حرام قرار دینا پڑے گا۔ رعایت لفظی کی طرح تمام صنعتوں کے استعمال میں اس بات کا لحاظ رکھنا ضروری ہے کہ صنعت کلام کا مقصد اصلی نہ ہونے پائے بلکہ اگر فصاحت کے شرائط اور بلاغت کے لوازم کے ساتھ کوئی صنعت بھی بے تکلفی سے آجائے تو آجائے۔ یہ نہ ہو کہ صنعت لانے کی غرض سے کلام کے کسی نقص کی طرف سے آنکھیں بند کرلی جائیں۔

کچھ صنعتیں ایسی بھی ہیں جن کو علم بدیع کے قدیم ماہروں نے کلام کے صنائع میں شمار کیا ہے۔ لیکن حقیقت میں کلام کے حسن اور اثر میں ان کو مطلق دخل نہیں ہے اور شاعری وانشاپردازی سے ان کو کوئی تعلق نہیں ہے۔ اس لیے ان کو کلام کی صنعتیں سمجھنا صحیح نہیں معلوم ہوتا۔ ان صنعتوں میں بعض ایسی ہیں کہ فن کتابت سے تعلق رکھتی ہیں مثلاً صنعت فشاری، منقوطہ، مہلہ، فوق النقاط، تحت النقاط،

رقطا، خیفا۔
بعض ایسی ہیں کہ ان کو لفظی بازی گریاں اور لفظی شعبدہ بازیاں سمجھنا چاہیے۔
چونکہ ان صنعتوں کو حسن کلام سے کوئی تعلق نہیں ہوتا اس لیے جب تک کوئی بتانے والا بتا نہ دے یا کوئی اشارہ ان کا پتا نہ دے اس وقت تک ان کی موجودگی کا علم ہو جانا ایک اتفاقی امر ہوتا ہے۔ مثلاً ذیل کے بند میں ؂

رات ایک طرف ظلمت دوزخ تھی نگوں سار
راہ ایسی یہ سختی لشکر سے ہوئی تار
راز اس میں یہ تھا تیغ گلے کا ہوئی تھی ہار
راس آئی نہ یہ جنگ ہوئے جینے سے بیزار
ہے صنعت مقلوب کل اوّل تو بہ جا ہے
آخر و لد القلب ہر اک اہل جفا ہے

اگر شاعر خود نہ بتا دیتا تو کون سمجھتا کہ اس بند کے پہلے، دوسرے تیسرے اور چوتھے مصرعے کے آخری لفظوں کے الٹنے سے بالترتیب دوسرے تیسرے چوتھے اور پہلے مصرعے کے ابتدائی لفظ بنتے ہیں۔ اس صنعت سے کلام میں کوئی حسن تو نہ آیا البتہ ایک بے لطف تکلف پیدا ہو گیا، اور شاعر کو اپنا سلسلۂ کلام قطع کر کے پانچویں مصرعے میں یہ بتانا پڑا کہ اس بند میں فلاں صنعت استعمال کی گئی ہے۔ جو لوگ استعمال صنائع کو کلام کا مقصود سمجھیں، وہ اس بند پر وجد کریں لیکن مذاق سلیم کا فیصلہ تو یہی ہے کہ کسی صنعت کی خاطر کلام میں بے ربطی پیدا کر لینا ادب کے قانون میں ایک سنگین جرم ہے۔ جو صنعتیں حقیقت میں شاعری اور انشا پردازی سے کوئی تعلق نہیں رکھتیں ان سے کلام میں حسن تو خیر آ ہی نہیں سکتا، ان کے استعمال کا انتہائی کمال یہ ہے کہ کلام میں کوئی نقص نہ پیدا ہو۔

اس میں شک نہیں کہ ان صنعتوں کا استعمال بھی بہ جائے خود ایک مشکل صنعت ہے، اور جب تک ایک خداداد صلاحیت کی تائید حاصل نہ ہو، کوئی شخص ان کے استعمال پر غیر معمولی قدرت نہیں رکھ سکتا۔ لیکن ان صنعتوں کے استعمال کا ملکہ اور چیز ہے اور شاعری اور چیز ہے۔ جو صناع ان صنعتوں میں کمال رکھتا ہے وہ شاعر نہیں بلکہ ایک طرح کا بازی گر اور شعبدہ باز ہے کہ لفظوں اور حرفوں کے الٹ پھیر سے طرح طرح کے کرتب دکھا کر لوگوں کو حیرت میں ڈالتا ہے۔

جو صنعتیں کلام کا زیور ہیں ان کے استعمال کے لیے بھی ایک خاص سلیقے کی ضرورت ہوتی ہے اور یہ سلیقہ بھی فطرت کی تائید کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتا۔ خالی زیور نہ حسن کی آرائش کر سکتا ہے نہ افزائش جب تک سلیقہ اس کا ساتھ نہ دے۔ اگر کوئی گلے کا زیور پاؤں میں اور ناک کا زیور کان میں لٹکائے یا زیوروں اور اعضا میں تناسب کا خیال نہ رکھے یا مناسب مقدار سے بہت زیادہ پہن لے تو نتیجہ کیا ہوگا، یہی کہ جو کچھ خدا کا دیا تھوڑا بہت حسن ہوگا وہ بھی رخصت ہو جائے گا۔ یہی حال صنعتوں کا بھی ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ صنعتوں کی کثرت نہیں بلکہ ان کا حسن استعمال دلیل کمال ہے۔

ان چند اصولی باتوں کو نظر میں رکھیے اور اردو کے شاعروں پر ایک نگاہ دوڑ لیجیے تو معلوم ہوگا کہ صنعتوں کے استعمال میں میر انیس کا مرتبہ سب سے بلند ہے۔ نسیم لکھنوی نے بھی اس فن میں بڑا نام کیا ہے۔ لیکن ان میں اور میر انیس میں بڑا فرق ہے۔ نسیم نے رعایت لفظی یعنی صنعت مراعاۃ النظیر کے استعمال میں تو وہ کمال دکھایا کہ کسی سے پیچھے نہیں رہے۔ لیکن اور صنعتوں کو بہت کم ہاتھ لگایا ہے۔ برخلاف اس کے میر انیس نے اکثر صنعتوں کو اس خوبی سے استعمال کیا ہے کہ اس خصوص میں بھی اردو شاعری ان کا نظیر پیش نہیں کر سکتی۔

جو لوگ صنعتوں کے محض استعمال اور حسن استعمال میں امتیاز نہیں کر سکتے اور صرف صنعتوں کی کثرت کو صناع کے کمال کی دلیل سمجھتے ہیں، اُن کی نظر میں بھی میر انیس کا پایہ بہت بلند رہے گا۔ میر صاحب نے اپنے کلام میں صنعتوں کے دریا بہائے ہیں۔ لیکن چند خاص وجہیں ہیں جن سے میر صاحب کی شاعری کے اس پہلو پر لوگوں کی نظر نہیں پڑتی۔ ایک وجہ تو یہ ہے کہ میر انیس کے کلام میں شاعری کے وہ تمام محاسن، جو صنائع سے کہیں زیادہ وقعت رکھتے ہیں، اس کثرت سے جمع ہیں کہ ان کے ہجوم میں صنعتوں کی طرف نظر نہیں جاتی۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ میر انیس نے صنعتوں کو اتنا نمایاں نہیں ہونے دیا ہے کہ وہ معنی سے اوپر ابھر جاتیں اور ذہن کو معنی کی طرف سے ہٹا کر اپنی طرف متوجہ کر لیتیں۔ صنعتوں کے استعمال کا کمال یہی ہے کہ اُن سے کلام کے حسن میں اضافہ ہو جائے اور ان کی موجودگی کا احساس بھی نہ ہو۔ صنعت کی غرض خود صنعت نہیں بلکہ حسن کلام ہے۔ کلام کا حسن بڑھانے میں معنوی صنعتیں لفظی صنعتوں

سے کہیں زیادہ کام کرتی ہیں اس لیے میر انیس نے انھیں کی طرف زیادہ توجہ کی ہے اور ایسی صنعتیں بہت ہی کم، گویا نہیں استعمال کی ہیں جن سے کلام کے حسن اور اثر میں کوئی اضافہ نہیں ہوتا اور نہ وہی صنعتیں استعمال کی ہیں جن کی طرف سامع کا ذہن آسانی سے منتقل نہیں ہو سکتا۔ خود کہتے ہیں ؏

سامعیں جلد سمجھ لیں جسے صنعت ہو وہی

انیس کے زمانے میں رعایت لفظی کے استعمال کا وہ زور تھا کہ لوگ اسی کو اصل شاعری سمجھنے لگے تھے۔ اپنے ماحول سے بالکل متاثر نہ ہونا تو انسانی فطرت کے خلاف ہے۔ انیس نے بھی اس صنعت کو خوب استعمال کیا، لیکن اُن کے صحیح مذاق نے وہ اعتدال قائم رکھا کہ ان کے کلام میں امانت کا رنگ نہیں آنے پایا۔ ابتدائی کلام میں کہیں کہیں یہ رعایت حدِ مناسب سے کسی قدر تجاوز بھی کر گئی ہے لیکن مشاقی کے بعد تو شاید ان دو مثالوں کے سوا تیسری مثال نہ ملے گی ؏ 'خالِ رُخ دیکھا تو گھر خال سے لگ جائے گا' ؏ 'کہیں کوثر کے تو چھینٹوں میں نہیں آیا ہے'۔ اس زمانے میں تو ان دونوں مصرعوں نے مذاقِ عام سے بڑی داد لی ہوگی لیکن ایسی لفظی رعایتیں اب ہمارے ذوق پر گراں ہوتی ہیں جن کی حد ضلع جگت کی سرحد سے مل جاتی ہے۔ ان دونوں مصرعوں پر بھی اسی وقت تک اعتراض کی انگلی اُٹھ سکتی ہے جب تک وہ اپنے مقام سے علاحدہ کر کے دیکھے جاتے ہیں ورنہ باکمال شاعر نے جس محل پر انھیں رکھ دیا ہے وہاں یہ اعتراض کی زد سے بالکل محفوظ ہیں۔ یہ دونوں مصرعے یزیدی فوج کے سردار عمر ابن سعد کی تقریر میں آئے ہیں۔ میر انیس نے امام حسین اور ان کے رفیقوں کی گفتگو میں ایسی مبتذل رعایتیں کبھی نہیں رکھیں۔ اس طرح زبانِ خاموشی سے انیس نے گویا یہ بھی بتا دیا کہ یہ سوقیانہ اور بازاری طرزِ کلام ہے جو سنجیدہ اور ثقہ لوگوں میں مقبول نہیں ہے۔

اب میں کلامِ انیس سے مختلف صنعتوں کی مثالیں پیش کرتا ہوں مگر چند مثالیں تو ہر شخص کے کلام میں ڈھونڈھ لی جا سکتی ہیں۔ حقیقت میں انیس کا کمال اس وقت ظاہر ہوگا جب آپ ان کا بہت سا کلام پڑھ کر خود دیکھیں کہ انھوں نے صنعتوں کا استعمال کس کثرت اور کس حسن سے کیا ہے۔

۱۔ تجنیس تام

۵۔ خیبر میں کیا گزر گئی روح الامین پر
کاٹے ہیں کس کی تیغ دو پیکر نے تین پر

ع کیا دخل جو بے دم لیے دم بھر کہیں دم لے (تلوار)

ع چنچل پہ ہو چنچل تو نہ آنکھوں کو خبر ہو (گھوڑا)

ع وہ قلب ہے جس قلب میں بغض ان کا بھرا ہے

ع سارے نہال فیض قدم سے ہوئے نہال

ع پیارے ہمارے بھائی کو بھائی ہے کیا جگہ

۲۔ تجنیس مرکب

پائی تھی عجب ہاتھ نے غازی کے صفائی
بس صاف تھی وہ ہو کہ نہ تیغ صف آئی

ع اب رو ہے سامنے نہ وہ ابرو ہزار حیف

ع ہر آئینہ سے بہتر و خوشتر ہر آئینہ

۳۔ تجنیس محرف

ع مُردوں کا مارنا نہیں مَردوں کا کام ہے

ع صفین میں لشکر کی صفیں ہو گئیں بے سر

ع دیکھاں ہے یہی روح یہی روح یہی ہے

ع جب یوں بڑھائے دل تو سواروں کے دل بڑھے

۴۔ تجنیس لاحق

ع حقا کہ تھا ظفر کا وسیلہ سفر ترا

ع فوجیں ہیں کہ موجیں ہیں یہ دریا ہے کہ لشکر

ع بچے نے آج پست کیا پیل مست کو

ع دال خود اماں کی طرح کماں گوشہ گیر تھی

ع ثابت کسی سرکش کے نہ ترکش کی سری تھی

ع چشم کشودہ صاف کمان کشیدہ ہے

۵۔ شبہ اشتقاق

ع صفیں میں صفوں کی صفائی بھی یاد ہے

ع دانتوں سے لڑائے کوئی ہوتی کی لڑھی کو

ع میداں کو ادھر باد بہاری نے بہارا

۶۔ تجنیس زائد

ع صاحب ہو تو ایسا جو مصاحب ہو تو ایسا

ع چاہیں تو وہ سبیل کریں سلسبیل کو

۷۔ تجنیس خطی

ع بل کھا کے اس طرف سے کوئی بیل بڑھا اگر

۸۔ تجنیس مرفو

س خالی نہ گیا وار کوئی تیغ دو سر کا
ہات اڑ گئے، گر پاؤں بچا کر کوئی سر کا

۹۔ تجنیس قلب

س فرفر رواں ادھر سے دم جست دخیز تھا
الٹا پھرا ادھر سے تو رفرف سے تیز تھا

س فرفر نفس کی آتی تھی نتھنوں سے جب صدا
کہتے تھے لوگ سب کہ ہے رفرف یہ بادپا

۱۰۔ ردالعجز علی الابتدا مع ردالعروض علی الصدر

س شاد اس کو کیا جس نے مجھے اس نے کیا شاد
بیداد ہوئی اس پہ تو مجھ پر ہوئی بیداد

۱۱۔ صنعت محاذ

آغاز رجز تھا کہ ہوئی تیروں کی بوچھار
شہزادۂ عالم نے کھنچ لی میان سے تلوار

تلوار کا کھنچنا تھا کہ تھا فوج میں رہوار
رہوار کی چل پھر میں صفیں ہو گئیں دو چار

اس شان سے تخت دل شیر صمد آیا
گویا صف آہو پہ یکایک اسد آیا

اس بند کے دوسرے تیسرے اور چوتھے مصرعے میں صنعت محاذ ہے۔

۱۲۔ تضمین المزدوج

ع کھنچے جو کماں دے نہ اماں پیل دماں کو
ع رُخ زرد دل میں درد بدن سرد تشنہ کام
ع شمشیر جاں ستاں وسناں دکماں و تیر
ع دار عنا مقام فنا منزل محن

ابر کرم غدیو عجم خسرو عرب
عالی ہمم امام امم شاہ تشنہ لب

۱۳۔ سیاق الاعداد

ششدر نہیں ہوتے جو شجاعت کے دھنی ہیں
تم چار ہو ہم دو ہیں مگر پنج تنی ہیں

پنجہ اٹھا کے ہاتھ یہ کہتا تھا بار بار — عالم میں پنج تن کی بزرگی ہے آشکار
یہ شش جہت انھیں کے قدم سے ہے برقرار — کیوں ہفتہ دوست ہوتے ہوئے قوم نابکار
آٹھوں بہشت ملتے ہیں مولا کے نام سے
بیعت کرو حسین علیہ السلام سے

حامی ہو ایک تن بھی تو آفت کی ہے سپر — یاں پنج تن ہیں پھر ہمیں کیا خوف کیا خطر
ششدر ہوں کس لیے جو ستم کے ہیں سات در — آٹھوں بہشت شاہ کے ہیں دوستوں کے گھر
نہ آسماں سے بھی کہیں درجے رفیع ہیں
چودہ خدا کے دوست ہمارے شفیع ہیں

۱۴۔ ذوقافیتین مع الحاجب

مضموں صفات قد کا قیامت سے لڑ گیا
قامت کے آگے سرو خجالت سے گڑ گیا

۱۵۔ صنعت مہملہ یا غیر منقوطہ

وہ طاہر و اطہر ہو اگر معرکہ آرا — معلوم ہو حملہ اسد اللہ کا سارا
آگاہ ہو کس طرح لکھو عمر کو مارا — صمصام کا اک وار ہوا کس کو گوارا
واللہ اگر اک دم کو وہ صمصام علم ہو — ہر روح کو اس دم ہوس ملک عدم ہو

اس طرح کا والا ہمم اس طرح کا سردار　　اس طرح کا عالم کا محمد اور مددگار
وہ مصدرِ الہام احمد محرمِ اسرار　　وہ اصل اصول کرم داور و دادار

حاصل، اگر اک مردِ دل آگاہ کو مارا
مارا اگر اس کو، اسد اللہ کو مارا

۱۶۔ صنعت تلمیح

ے　روحی فداک اے قمر برج ہل اتا
قلبی لدیک اے گہر تاج لا فتا

ع　العظمۃ للہ کی صدا برق سے نکلی
ع　صلوعلی النبی کی بیاباں میں دھوم تھی
ع　غضب اللہ علیہم کے عیاں تھے آثار
ع　اے خداوندِ جہاں خذ بیدی خذ بیدی
ع　دم بہ دم لب پہ یہ ہے این ابی این ابی

۱۷۔ تنسیق الصفات

عاشق، غلام، خادمِ دیرینہ، جاں نثار　　فرزند، بھائی، زینتِ پہلو، وفا شعار
راحت رساں، مطیع، نمودار، نام دار　　جرار، یادگارِ پدر، مخبرِ روزگار .

صفدر ہے، شیر دل ہے، بہادر ہے، نیک ہے
بے مثل سیکڑوں میں، ہزاروں میں ایک ہے

خوش خو، خوش خرام و خوش اندام و خوش لگام　　گل پوش و تیز، ہوش و سمن گوش و سرخ فام

۱۸۔ صنعت ایہام

ع　اک پھول کا مضموں ہو تو سو رنگ سے باندھوں
ع　قطرے کو جو دوں آب تو گوہر سے ملا دوں
ع　اک ایک کوس راہ جبل میں پہاڑ تھا
ع　ایسا گنہ کیا ہے کہ کچھ جس کی حد نہیں (اصطلاح شرع میں حد گناہ کی سزا کو کہتے۔)
ع　چپ ہوں مگر زباں ہے وہی اپنے کام میں

۱۹۔ ایہام تناسب

ع چشموں سے خوف حق میں رواں جوئے اشک ہو

ے مجلس کو رنگ نظم سے رشک چمن کروں
مداحئ حسین بہ وجہ حسن کروں

ے چھوڑے اگر شعاع کی جلیں نہ آفتاب
کیا تاب ہے کہ لا سکے اس کی چمک کی تاب

۲۰۔ صنعت طباق یا تضاد

ع جب بندھ چکیں صفیں تو علم کھل گئے تمام

ع مشکل کشا کے لال نے کھولے تمام بند

ع تو عالم و دانا ہے کہ میں ہیچ مداں ہوں

ع ثابت نہ ہوا کب صف اول ہوئی آخر

ع پیری کے دولے ہیں خزاں کی بہار ہے

۲۱۔ ایہام تضاد

ع دانستہ بھلا اپنا بُرا کرتا ہے کوئی

ع سر پہ یا دھوپ ہے یا چھاؤں ہے تلواروں کی

۲۲۔ تاکید المدح بما یشبہ الذم

زوج اس کا ہے اقلیم امامت کا شہنشاہ پر دولت دنیا سے ہے ان دونوں کو اکراہ

۲۳۔ تجاہل عارف

ع فوجیں ہیں کہ موجیں ہیں یہ دریا ہے کہ لشکر

۲۴۔ مراعاۃ النظیر

ے رہوار بڑھے جاتے ہیں باگوں کو سنبھالو حلقہ ہے کڑی آنکھ زرہ پوشوں پہ ڈالو

ے چوما ادب سے پائے امام انام کو خم ہوگئے تمام نمازی سلام کو

ے مانند سجدہ رفتہ ایماں قوی کرے دانا وہ ہے امام کی جو پیروی کرے

ے جوشن یہی ہے بازو دے برنا و پیر کا بعد اس کے خاتمہ ہے صغیر و کبیر کا

ے کوسوں گئے پانی کے تجسس میں ہوا خواہ جز خاک نہ چشمہ کہیں دیکھا نہ کہیں چاہ

ﮯ لکھے ہوئے ہیں شیروں کے حملے کتاب میں | فصلیں ہیں اپنے زور کی خیبر کے باب میں
ﮯ مرنے چلے جب شان سے چلنے کے دن آئے | سائے میں پلے دھوپ میں جلنے کے دن آئے
مرجھائے جو سبزے کے نکلنے کے دن آئے | رت پھر گئی جب پھولنے پھلنے کے دن آئے

افسوس مزا عالم فانی کا نہ دیکھا
کچھ تم نے ثمر باغ جوانی کا نہ دیکھا

ع بچپن میں لڑکے زور جوانی دکھا دیا۔ (لفظ لڑکے کی وجہ سے ایہام تناسب بھی پیدا ہو گیا ہے۔

ع وہ دُر ہے یہ دُر جان لڑی رہتی ہے جس سے
ع پکڑی کلائی ہاتھ سے بازوے شاہ نے

۲۵۔ لف و نشر

یہ لب یہ خط یہ چشم یہ ابرو یہ رخ یہ خال | یاقوت و مشک و نرگس و نجم و مہ و ہلال

(دونوں مصرعوں میں نصف اول میں لف و نشر مرتب اور نصف آخر میں لف و نشر معکوس الترتیب ہے)

ﮯ شمشیر جاں ستاں و سنان و کمند و تیر | بے آب و سر بریدہ و ژولیدہ و حقیر
ﮯ وہ سم وہ نعل اور وہ سینہ وہ ترک تاز | بدر و ہلال و آئینہ و کبک و شاہ باز
ﮯ پھٹتی تھیں، بھاگی جاتی تھیں، گھٹتے تھے خاک کو | قبضوں سے تیغیں، جھوں سے زرہیں تنوں سے سر
ﮯ اڑ جاتے تھے، گرتی تھی، نکل جاتی تھی تن سے | سر تن سے، سپر ہاتھ سے اور روح بدن سے
ﮯ واللیل و والضحیٰ، رخ روشن خط سیاہ | لعل و غزال و گل، لب و رخسار و چشم شاہ
ﮯ ابرو و زلف و روشِ قد و ہلال و ماہ | تیر و سنان و زہ، مژہ و سرمہ و نگاہ

۲۶۔ صنعت مقابلہ

ﮯ جو آکے نہ جائے وہ بڑھاپا دیکھا | جو جاکے نہ آئے وہ جوانی دیکھی

۲۷۔ صنعت جمع

چرخ و نجوم و شمس و قمر، شہر و دشت و در | سنگ و معادن و صدف و قطرہ و گہر
اشجار و شاخ و برگ و گل و غنچہ و ثمر | رکن و مقام و باب و منا، زمزم و حجر
جن و ملک ہیں، انس ہیں، غلمان و حور ہیں | کہہ دیں یہ سب کہ ابن علی بے قصور ہیں

حور و ملک و خلد و ارم، کوثر و طوبا　　سنگ و شجر و کوہ و بر و گوہر و دریا
خورشید و نجوم و قمر و گنبد خضرا　　روم و رے و مصر و نجف و یثرب و بطحا

پوچھے جو کوئی کون امام ازلی ہے
سب دیں یہ گواہی کہ حسین ابن علی ہے

ع　فاقوں میں دل بھی چشم بھی اور نیتیں بھی سیر

۲۸۔ صنعت تقسیم

کٹ کٹ کے ذوالفقار سے گرتے تھے خاک پر　　پنجوں سے ہاتھ، شانوں سے بازو، تنوں سے سر
قبضے سے تیغ، بر سے زرہ، ہاتھ سے سپر　　برچھی سے پھل، کمان سے زہ، زین سے تبر
ترکش کہیں پڑے تھے، نشان زری کہیں
پیکاں کہیں تھے، شست کہیں تھی، بری کہیں

؎ گرتے تھے بار بار یہی تھا نزّ صول　　برچھی سے پھل، کمان سے شاخیں پر سے پھول

۲۹۔ جمع و تقسیم

؎ جنت انعام کر کر دوزخ میں جلا　　وہ رحم تمہارا ہے یہ عدالت تیری

۳۰۔ جمع و تفریق و تقسیم

نکلا ادھر سے جو وہ اجل کا شکار تھا　　پیدل ہو یا سوار یہ دو تھا وہ چار تھا

۳۱۔ صنعت رجوع

؎ اختر سے بھی آبرو میں بہتر ہیں اشک　　اللہ ہے مشتری وہ گوہر ہیں اشک
آنکھوں سے لگا کے ان کو کہتے ہیں ملک　　گوہر نہیں نور چشم کوثر ہیں اشک

۳۲۔ صنعت حسن التعلیل

؎ ڈر سے ہوا فرات کی موجوں کو اضطراب　　اور آب میں سروں کو چھپانے لگے حباب
؎ ہر غول میں علم سے علم جھک کے لڑ گیا　　جو رہ گیا نشاں وہ خجالت سے گڑ گیا
؎ دریا نہ تھمتا خون سے اس برق تاب کے　　لیکن پڑے تھے پاؤں میں چھالے حباب کے
؎ مردم تھے سات پردوں کے اندر عرق میں تر　　خس خانۂ مژہ سے نکلتی نہ تھی نظر
؎ آئینۂ فلک کو نہ تھی تابِ تب کی تاب　　چھپنے کو برق چاہتی تھی دامن سحاب

ے چہرے پہ آفتاب کے مقتل کی گرد تھی — یہ خوف تھا کہ دھوپ کی رنگت بھی زرد تھی

ے تھا بس کہ روزِ قتلِ شہِ آسماں جناب — نکلا تھا خوں ملے ہوئے چہرے پہ آفتاب

تھی نہر علقمہ بھی خجالت سے آب آب — روتا تھا پھوٹ پھوٹ کے دریا میں ہر حباب

پیاسی جو تھی سپاہِ خدا تین رات کی
ساحل سے سر پٹکتی تھیں موجیں فرات کی

ع ہو گیا جوڑ کے ہاتھوں کو جلاجل خاموش (امام حسین کی آواز کے رعب سے)

ع اکبر سے بھی دغا میں کچھ آگے بڑھی رہی (حضرت علی اکبر کی تلوار)

۲۳۔ صنعتِ عکس

ع قوت کو ضعف، ضعف کو قوت تھی دم بہ دم

ع پانی میں آگ، آگ میں پانی خدا کی شان

ع آگے تھا ہرن شیر سے اور شیر ہرن سے

۲۴۔ صنعت مبالغہ

۱۔ وہ لُو، وہ آفتاب کی حدّت، وہ تاب و تب — کالا تھا رنگ دھوپ سے دن کا مثالِ شب

گر آنکھ سے نکل کے ٹھہر جائے راہ میں — پڑ جائیں لاکھ آبلے پائے نگاہ میں

گرمی سے مضطرب تھا زمانہ زمین پر — بھُن جاتا تھا جو گرتا تھا دانہ زمین پر

گرداب پر تھا شعلۂ جوّالہ کا گماں — انگارے تھے حباب تو پانی شرر فشاں

پانی تھا آگ گرمی روزِ حساب تھی — ماہی جو سیخِ موج تک آئی کباب تھی

وہ لو وہ تپش اور وہ گرمی کا مہینا — سردی میں ہو ذکر اس کا تو آ جائے پسینا

۲۔ کاوے میں شکلِ گنبدِ دوّار پھیر لو — نقطے کے گرد صورتِ پرکار پھیر لو

۳۔ ع اللہ ری ضو جھپکتی ہے آنکھ آفتاب کی

۴۔ ع تھمتی نہ معرکے میں جو ہوتے زمیں کے پاؤں

۵۔ کاٹا پلک میں آنکھ کو پتلی میں نور کو — پاؤں میں کج روی کو سروں میں غرور کو

سینے میں بغض و کینے کو، دل میں فتور کو — نیت میں معصیت کو، طبیعت میں زور کو

ذات اک طرف، مٹا دیا بالکل صفات کو
کیسی زباں، زباں میں یہ کاٹ آئی بات کو (تلوار کی تعریف)

۲۵۔ صنعت ترجمہ

شہ نے سنا عرب سے جو سارا یہ ماجرا　　فرمایا "بازگشت ہے سب کی سوئے خدا"[1]
خود نوید زندگی لائی قضا میرے لیے　　شمع کشتہ ہوں فنا میں ہے بقا میرے لیے

(چو شمع کشتہ باشد در فنائے من بقائے من)

۲۶۔ صنعت التزام

اعدا کے حق میں ہوگیا آب حسام سم　　کرتے تھے آہوؤں کی طرح خوش خرام رم
نیزے تھے خوف سے صفت چوب خام خم　　ایسا لڑا جہاں میں کوئی تشنہ کام کم
دشمن بھی معترف تھے وہ بیکار کر گئے
مقتل سے اڑ کے تا بہ سر کہسار سر گئے

رکھتا نہیں کوئی یہ عزیب الدیار یار　　شمشیر شعلہ بار پڑے سر پہ بار بار
تیروں کی تن پہ دور سے ہو بے شمار مار　　نیزے اٹھا اٹھا کے کریں سب سوار وار
آگے سے تیغ و خنجر و تیر و سناں چلے
پیچھے سے فرق پاک پہ گرز گراں چلے

لاکھوں سے یہ ہزبر جو تنہا لڑے لڑے　　تیغوں کے پھل جو پھول سے تن پر پڑے پڑے
ہوتے ہیں غازیوں کے ارادے بڑے بڑے　　چاہیں تو روم و شام کو لے لیں کھڑے کھڑے
بالائے دوش ڈھال تھی قبضے پہ ہاتھ تھا
خیبر میں کون شیر الٰہی کے ساتھ تھا

۲۷۔ صنعت ادماج

؎ خیمے کے قریب آن کے اک ظالم بے پیر　　چلّایا کہ لو ٹوٹ گئے بازوئے شبیر
ع　اس روز سے اب تک کلمہ پڑھتے ہیں جنّات
؎ حقا کہ بلک فواز ہے ذات تری　　جنت انھیں اشکوں کے بہانے سے ملی

---

[1] انا الیہ راجعون۔

۲۸۔ صنعت موازنہ

ع اے تیغ زباں جوہر تقریر دکھا دے اے دستِ قلم قوت تحریر دکھادے
اے ذہن رسا نظم کی توقیر دکھا دے اے حُسن بیاں نور کی تصویر دکھا دے

۲۹۔ صنعت ردالعجز علی الصدر مع تجنیس تام

ع سر ہو یہ مرحلہ جو کٹے میرے تن سے سر

میرے نزدیک شعر کے محاسن میں صنعتوں کا درجہ بہت پست ہے۔ اس لیے میری نظر صنعتوں پر بہت کم پڑتی ہے۔ اس کے علاوہ میں نے صنعتوں کی تلاش میں کوئی خاص کاوش نہیں کی۔ اس لیے میں ان تمام صنعتوں کی مثالیں پیش نہیں کر سکا جو میر انیس کے کلام میں موجود ہیں یا جو صنعتیں کلام کے حسن میں کچھ دخل نہیں رکھتیں اور جن کا ذکر میں اوپر کر آیا ہوں اُن میں سے بعض کو میر انیس نے بہت کم استعمال کیا ہے اور بعض کو بالکل استعمال ہی نہیں کیا۔ لیکن ان کی جگہ ایسی صنعتیں ایجاد بھی کر دی ہیں کہ جن کا کوئی نام اب تک مقرر نہیں ہے۔ ایسی صنعتوں کی چند مثالیں میں نے صنعتِ التزام کے تحت میں لکھ دی ہیں۔ چند اور لکھتا ہوں۔

۱۔ الجھاتے تھے کمند کمینے کمان میں
۲۔ بے کار کمیں میں ہیں کمینوں کی کمانیں
۳۔ گویا گلے میں حور کے ہیرے کا ہار تھا
۴۔ دہشت تھی کہ وحشت کو ہرن بھول گئے تھے
۵۔ تازی کو تیز کر کے یہ غازی نے دی صدا

صنعتوں کے استعمال کے ساتھ سلاست اور روانی کا قائم رکھنا اور جملہ محاسن کلام اور مقتضیات مقام کا لحاظ رکھنا خود ہی بڑا مشکل کام ہے، لیکن میر انیس نے کمال یہ کیا ہے کہ اکثر موقعوں پر ایک ایک بیت اور ایک ایک مصرعے میں کئی کئی صنعتیں برتی ہیں اور اس سے بھی مشکل کام یہ کیا ہے کہ صنعت در صنعت استعمال کر کے کلام کے حسن کو اور بھی چمکا دیا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ صنعتوں کے استعمال میں بھی میر انیس اپنا جواب نہیں رکھتے لیکن ان کی شاعری کا مرتبہ اس سے کہیں بلند ہے کہ استعمال صنائع کو ان کے آیات کمال میں شمار کریں۔ میر انیس کی شہرت بھی صنعتوں

کے استعمال کی بنا پر نہیں ہے۔ اور آج کا کیا ذکر جس زمانے میں بد مذاقی صنعتوں کو اصل شاعری سمجھتی تھی اس زمانے میں بھی صنائع کا استعمال میر صاحب کی شاعری کے لیے طرۂ امتیاز نہ تھا۔ میر انیس کا کمال تو اس سادگی میں اپنے جوہر دکھاتا تھا جس پر ہزار صنعتیں نثار ہیں اور یہ میر انیس کی شاعری کا معجزہ تھا کہ زمانے کے ذوق کو اپنی طبیعت کے خلاف اس کے سامنے سر بسجود ہونا پڑا۔ چند نمونے اس اعجازی سادگی کے بھی ملاحظہ ہوں۔

(۱) نوجوان سعید و رشید فرزند آخری رخصت کی درخواست کرتا ہے اور حضرت امام حسین جواب میں فرماتے ہیں ؂

کیونکر جدا نگاہ سے بیٹا کریں تمھیں آنکھیں یہ چاہتی ہیں کہ دیکھا کریں تمھیں

(۲) اپنی آخری رخصت کے وقت امام حسین اپنی سہ سالہ دختر سکینہ کو سمجھاتے ہیں ؂

یاد کرکے ہمیں راتوں کو نہ رونا بیٹا سو چکیں چھاتی پہ اب خاک پہ سونا بیٹا

(۳) روز عاشورہ امام حسین اپنے گھوڑے سے فرماتے ہیں ؂

تو زباں خشک جو منھ پھیر کے دکھلاتا ہے پسرِ ساقیِ کوثر کو حجاب آتا ہے

(۴) روز عاشورہ امام حسین ایک نووارد مسافر سے مہمان نوازی نہ کر سکنے کا عذر فرماتے ہیں ؂

یہ ہے غربت کی عجب شام و سحر ہوتی ہے تیسرا دن ہے کہ فاقوں میں بسر ہوتی ہے

(۵) حضرت زینب اپنے نوعمر بیٹوں کو سمجھاتی ہیں کہ نسب پر فخر کرنا کیا، اپنے کارناموں سے اپنے بزرگوں کی یاد تازہ کر دو ؂

تم کیوں کہو کہ شیر خدا کے دل کے ہیں فوجیں پکاریں خود کہ نواسے علی کے ہیں

(۶) شاعر انصار امام حسین کی تعریف میں کہتا ہے ؂

پیاس ایسی تھی کہ آ آ گئی جاں ہونٹوں پر صابر ایسے تھے کہ پھیری نہ زباں ہونٹوں پر

سچ ہے حسن ذاتی کو زیور کی ضرورت نہیں۔ میر انیس خود فرماتے ہیں ؂

خورشید کو کچھ حاجت زیور نہیں زنہار پھولوں پہ کوئی عطر لگائے تو ہے بے کار

ایک مُباحثہ

میرا ایک مضمون "میر انیس کے کلام میں صنعتوں کا استعمال"* کے عنوان سے رسالہ زمانہ، کان پور کے شمارہ مئی ۱۹۲۸ء میں شائع ہوا تھا۔ اس مضمون کی اشاعت کے کوئی ڈیڑھ سال بعد کسی صاحب نے 'نقاد الہ آبادی' کے نام سے اس پر کچھ "اعتراض" وارد کیے[2]۔ میں ان اعتراضوں کے جواب دینے میں اپنا وقت ضائع نہ کرتا لیکن چونکہ میری خاموشی سے ان غلط فہمیوں کو ہوا ملتی جو حضرت 'نقاد' پیدا کرنا چاہتے تھے، اس لیے مناسب معلوم ہوا کہ ان کا سدباب کر دیا جائے۔

ان صفحات میں پہلے 'نقاد الہ آبادی' کے "اعتراض" اور اس کے بعد اسی ترتیب سے ان کے "جوابات" درج کیے جا رہے ہیں۔

نقاد الہ آبادی کے اعتراض

زمانہ بابت ماہ مئی ۱۹۲۸ء میں سید مسعود حسن صاحب رضوی ادیب ایم اے لکچرار لکھنؤ یونی ورسٹی کا ایک مضمون مندرجۂ بالا عنوان* سے شائع ہوا ہے۔ اس کو پڑھ کر حیرت ہوتی ہے کہ قابل مضمون نگار نے صنعتوں کے تحت میں جو اشعار لکھے ہیں ان میں زیادہ تر تو وہی ہیں جو بحرالفصاحت و موازنۂ انیس و دبیر وغیرہ میں درج ہیں اور ان میں واقعی وہ صنعتیں بھی ہیں جو بیان کی گئی ہیں لیکن کچھ اشعار ایسے بھی ہیں جو خاص سید صاحب کے منتخب کردہ ہیں اور وہ صنائع متذکرہ کے تحت میں نہیں آتے۔ بعض شعر ایسے بھی ہیں جو دوسرے شعرا کے ہیں مگر غلطی سے صاحب بحرالفصاحت نے

مطبوعہ ماہ نامہ زمانہ، کان پور، جنوری ۱۹۳۰ء۔ [2] رسالہ زمانہ کے ایڈیٹر صاحب (منشی دیا نرائن نگم) کی عنایت سے مجھ کو یہ مضمون اشاعت سے پہلے دیکھنے کو مل گیا تھا۔

میرانیس کی جانب منسوب کر دیے ہیں، لائق مضمون نگار نے بھی ان کو بلا تحقیق میرانیس سے منسوب کر دیا ہے۔

بعض غلطیاں ایسی ہوتی ہیں کہ وہ بعض مقامات پر زیادہ اہمیت نہیں رکھتیں لیکن بعض مقام پر وہی غلطیاں زیادہ اہم ہو جاتی ہیں۔ مثلاً صاحب بحرالفصاحت سے جو یہ غلطی ہوئی کہ انھوں نے دوسرے شعرا کے اشعار کو میرانیس کی جانب منسوب کر دیا تو وہ زیادہ توجہ کے قابل نہیں۔ اس لیے کہ انھوں نے خاص موضوع پر کتاب لکھی ہے اور مثالوں میں شعر لکھے ہیں۔ اس میں صرف یہ بات دیکھنے کے قابل ہے کہ مثال تعریف سے مطابقت کرتی ہے یا نہیں۔ اس کے دیکھنے کی ضرورت نہیں ہے کہ مثال میں جو شعر پیش کیا گیا ہے وہ کس کا ہے۔ اسی لیے مستند و غیر مستند شاعر کا بھی خیال نہیں کیا جاتا۔ چنانچہ صاحب بحرالفصاحت کو اس کی تحقیق کی ضرورت نہیں تھی کہ یہ کس شاعر کا شعر ہے۔ لیکن سید مسعود حسن صاحب رضوی نے خاص میرانیس پر مضمون لکھا ہے، ان کا فرض تھا کہ وہ تحقیق کے ساتھ صرف وہی اشعار پیش کرتے جو میرانیس کے ہیں اور جو غلطی صاحب بحرالفصاحت نے کی تھی اس کا اعادہ نہ کرتے۔ مثلاً صنعت مبالغہ میں مرزا دبیر کا یہ بند صاحب بحرالفصاحت نے میرانیس کے نام سے لکھا ہے، چنانچہ آپ نے بھی اسی کو نقل کر لیا ہے ؎

کاٹا پلک میں آنکھ کو، پتلی میں نور کو	پاؤں میں کج روی کو، سروں میں غرور کو
سینے میں بغض و کینہ کو، دل میں فتور کو	نیت میں معصیت کو، طبیعت میں زور کو

ذات اک طرف مٹا دیا بالکل صفات کو
کیسی زباں، زباں میں یہ کاٹ آئی بات کو

جس شخص نے میرانیس کا کلام دیکھا ہے وہ فوراً کہہ اٹھے گا کہ یہ طرز بیان میرانیس کا نہیں۔ مرزا دبیر کے جس مرثیے کا یہ بند ہے اس کا مطلع ہے ؎

"کیوں عرش ذوالجلال کا سرتاج عین ہے"

صنعت ایہام تناسب میں صاحب بحرالفصاحت نے شیخ گوہر علی مشیر کی یہ بیت میرانیس کے نام سے لکھ دی ہے۔ آپ نے بھی اسی کی نقل کر دی ؎

مجلس کو رنگ نظم سے رشک چمن کروں
مداحیِ حسین بہ وجہ حسن کروں

کیا کوئی صاحب مذاق یہ کہہ سکتا ہے کہ اس بیت میں میر انیس کا رنگ ہے۔ میر کے جس مرثیے کی یہ بیت ہے اس کا مطلع ہے ع

"مداح بادشاہ ذوی الاقتدار ہوں"

ہم یہاں پر زیادہ مثالیں دے کر مباحثے کو طوالت دینا نہیں چاہتے، صرف یہ دکھانا مقصود ہے کہ لکچرار صاحب کی نسبت سنتے ہیں کہ انھوں نے اپنی زندگی انیس کے لیے وقف کر دی ہے اور بہت مدت سے میر انیس پر کام کر رہے ہیں، تاہم کلام میر انیس سے اس قدر کم واقف ہوئے ہیں۔ خیر اب ہم اُن چند اشعار کو لکھتے ہیں جن میں سید صاحب نے صنعتوں کے لکھنے میں غلطی کی ہے :۔

صنعت مراعات النظیر کی مثال میں ذیل کا شعر پیش کیا ہے ؎

دانا ہے وہ امام کی جو پیروی کرے	مانند رشتہ سبحۂ ایماں قوی کرے

میرے خیال میں اگر کسی طالب علم سے بھی پوچھا جائے تو وہ یہ بتا دے گا کہ اس شعر میں دانا اور امام سے مراد سبحے کا دانہ وامام نہیں ہے بلکہ دانا کے معنی عقل مند اور امام کے معنی پیشوا کے ہیں اور یہ جب معنی ہیں تو سبحہ کی مناسبت سے صنعت مراعات النظیر کیسے ہو سکتی ہے۔ کیونکہ صنعت مراعات النظیر کی تعریف یہ ہے کہ کلام میں ایسے الفاظ ہوں جن کے معنی آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ سوائے نسبت تضاد کے کوئی مناسبت رکھتے ہوں یعنی معنی کی شرط ہے اور عقل مند اور پیشوا کو سبحہ سے کوئی مناسبت نہیں ہے، لہٰذا اس شعر میں صنعت مراعات النظیر نہیں ہے بلکہ صنعت ایہام تناسب ہے کیونکہ صنعت ایہام تناسب اس کو کہتے ہیں کہ کلام میں ایسے الفاظ ہوں جن میں ایک لفظ کے معنی دوسرے لفظ کے معنی سے اس کلام میں تو کچھ مناسبت نہ رکھتے ہوں لیکن کسی لفظ کے ایک معنی ایسے بھی ہوں جو دوسرے لفظ کے معنی سے کچھ مناسبت رکھتے ہوں اور شاعر نے کلام میں اس معنی کو ترک کر دیا ہو۔ اس شعر میں دانا اور امام کے وہ معنی جو سبحہ سے تعلق رکھتے ہیں، شاعر نے بالکل ترک کر دیے ہیں، لہٰذا یہ صنعت ایہام تناسب ہے۔ اسی طرح ذیل کے اشعار جو صنعت مراعات النظیر کی تحت میں وہ بھی غلط لکھے ہیں

حلقے ہے کڑی آنکھ زرہ پوشوں پہ ڈالو	رہوار بڑھے جاتے ہیں باگوں کو سنبھالو
خم ہو گئے تمام نمازی سلام کو	چوما ادب سے پائے امام انام کو
بعد اس کے خاتمہ ہے صغیر و کبیر کا	جوشن یہی ہے بازوئے برناو پیر کا

لکھے ہوئے ہیں شیروں کے حلے کتابیں   فصلیں ہیں اپنے زور کی خیبر کے باب میں

تجنیس مرفو کی مثال میں یہ شعر لکھا ہے ؎

خالی نہ گیا وار کوئی تیغ دو سر کا   ہاتھ اڑ گئے گر پاؤں بچا کر کوئی سر کا

حالانکہ یہ تجنیس مرفو نہیں بلکہ تجنیس مرکب تشابہ ہے۔

تجنیس زائد کی مثال میں ہے۔ ع چاہیں تو وہ سبیل کریں سلسبیل کو

تجنیس زائد کے لیے شرط ہے کہ دو متجانس لفظوں میں سے ایک حرف زائد ہو خواہ اول میں ہو یا درمیان میں یا آخر میں۔ سبیل سے سلسبیل میں دو حرف زائد ہیں اس لیے تجنیس زائد نہیں ہو سکتی۔ اگر ہو سکتی ہے تو صنعت شبہ اشتقاق ہو سکتی ہے جس کو تجنیس سے کوئی تعلق نہیں۔

اس بند کو صنعت موازنہ میں لکھا ہے ؎

اے تیغ زباں جوہر تقریر دکھا دے   اے دست قلم قوت تحریر دکھا دے

اے ذہن رسا نظم کی توقیر دکھا دے   اے حسن بیاں نور کی تصویر دکھا دے

صنعت موازنہ کا نام اب تک نہیں سنا گیا۔ ہم بہت مشتاق ہیں اگر سید صاحب کسی ایسی مستند کتاب کا نام بتائیں جس میں اس صنعت کا ذکر ہو۔ سجع متوازن ہوتا ہے جس کو سجع موازنہ بھی کہہ سکتے ہیں لیکن وہ دوسری چیز ہے۔

صنعت ادماج کی مثال میں یہ مصرع ہے۔ ع

اس روز سے اب تک کلمہ پڑھتے ہیں جنّات

صنعت ادماج اس کو کہتے ہیں کہ پورے کلام سے دو معنی نکلتے ہوں اور صنعت ایہام میں ایک کلمے کے دو معنی ہوتے ہیں۔ مصرع جو لکھا ہے اس میں کلمہ پڑھنے کے دو معنی ہیں لہٰذا یہ صنعت ادماج نہیں بلکہ صنعت ایہام کے تحت میں آئے گا۔

آخر میں لکچرار صاحب نے یہ بھی لکھا ہے کہ میر انیس نے ایسی صنعتیں بھی استعمال کی ہیں جن کا کوئی نام اب تک مقرر نہیں ہوا اور مثالاً یہ دو مصرعے لکھے ہیں:۔

ع   تازی کو تیز کر کے یہ غازی نے دی صدا

ع   دہشت تھی کہ وحشت کہ ہرن بھول گئے تھے

میں یہ عرض کرتا ہوں کہ جناب ان صنعتوں کا نام مقرر ہے۔ پہلے مصرعے

میں جو صنعت ہے اس کو تجنیس لاحق کہتے ہیں اور دوسرے مصرعے میں جو صنعت ہے اس کو تضمین المزدوج۔ آپ نے خود بھی ان دونوں صنعتوں کی مثالیں لکھی ہیں لیکن نہ معلوم آپ کس بنا پر ان مصرعوں کو ان کے تحت میں جگہ نہ دے سکے۔
یہ چند غلطیاں مثالاً لکھی گئی ہیں ورنہ اس مضمون میں اس قسم کی اور بھی غلطیاں موجود ہیں۔

نقاد الہ آبادی کے اعتراضوں کے جواب

(۱) جناب نقاد فرماتے ہیں کہ میں نے اپنے مضمون میں صنعتوں کی مثالوں میں زیادہ تر وہی شعر پیش کیے ہیں جو موازنہ انیس و دبیر اور بحر الفصاحت وغیرہ میں درج ہیں۔ اس غلط بیانی کی حقیقت ظاہر کرنے کے لیے میں نے ایک نقشہ بنایا تھا جس سے معلوم ہوتا تھا کہ میرے مضمون میں کتنی مثالیں ایسی ہیں جو ان کتابوں میں بھی موجود ہیں اور کتنی مثالیں نئی ہیں۔ وہ نقشہ کہیں گم ہو گیا۔
میں نے مجموعی طور پر ایک سو انیس (۱۱۹) مثالیں پیش کی ہیں جن میں صرف ۲۰ مثالیں ایسی ہیں جو موازنہ یا بحر الفصاحت میں بھی موجود ہیں۔ ان ۲۰ مثالوں میں بھی کم سے کم سات ایسی ہیں جن کے متعلق ثبوت کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ وہ ان کتابوں سے نقل نہیں کی گئی ہیں بلکہ مرثیوں سے لی گئی ہیں اور وہ حسب ذیل ہیں۔
۱۔ بحر الفصاحت میں یہ شعر صنعت لف و نشر غیر مرتب کی مثال میں لکھا گیا ہے ؎

چھپتی تھیں، بھاگی جاتی تھیں، گرتے تھے خاک پر
قبضوں سے تیغیں، جسموں سے روحیں، تنوں سے سر

میں نے "چھپتی تھیں" کی جگہ "چھٹتی تھیں" لکھا ہے جس سے یہ شعر لف و نشر مرتب کی مثال ہو گیا۔
۲۔ موازنہ میں ایک مثال صنعت تفصیل کے تحت میں درج ہے اور بحر الفصاحت میں وہی مثال صنعت تقسیم کے تحت میں لکھی گئی ہے۔ میں نے بھی اس کو صنعت تقسیم کی مثال قرار دیا ہے لیکن ان دونوں کتابوں میں بند کے صرف ابتدائی چار مصرعے نقل کیے گئے ہیں اور میں نے پورا بند لکھا ہے۔

۳۔ حسن تعلیل کی ایک مثال تینوں کے یہاں مشترک ہے۔ لیکن موازنہ اور بحر الفصاحت میں صرف بیت لکھ دی گئی ہے اور میں نے پورا بند نقل کیا ہے۔

۴۔ حسن تعلیل کی دوسری مثال یعنی "ہو گیا جوش کے ہاتھوں کو جلاجل خاموش" کے آگے میں نے بریکٹ میں لکھ دیا ہے "امام حسین کی آواز کے رعب سے" یہ مثال موازنہ، میں بھی ہے لیکن بریکٹ کی عبارت نہیں ہے۔

۵۔ صنعت جمع و تفریق و تقسیم کی مثال میں جو شعر میں نے لکھا ہے وہ بحر الفصاحت میں بھی موجود ہے لیکن میرے یہاں اس کا دوسرا مصرع کسی قدر بدلا ہوا ہے۔

۶۔ ایستادہ آب میں یہ روانی خدا کی شان ؎ پانی میں آگ آگ میں پانی خدا کی شان مولانا شبلی نے اس شعر کو صنعت طباق کی مثال قرار دیا ہے اور صاحب بحر الفصاحت نے صنعت عکس کی۔ میں نے صنعت عکس کی تین مثالیں دی ہیں۔ ان میں اس شعر کا صرف دوسرا مصرع شامل ہے۔

۷۔ صنعت مبالغہ کی مثال میں مولانا شبلی نے ایک مقام کے پانچ بند مسلسل نقل کیے ہیں، لیکن میں نے صرف وہ پانچ شعر لکھے ہیں جن میں مبالغہ بہت نمایاں ہے۔

اب رہیں صرف تیس مثالیں، انصاف سے سوال ہے کہ اگر تین آدمی الگ الگ انیس کے کلام سے مختلف صنعتوں کی بہت بہت سی مثالیں ڈھونڈھ کر نکالیں تو کیا اُن میں بعض مثالیں تینوں کے یہاں اور بعض دو کے یہاں مشترک نہ ہو جائیں گی؟ اگر ایسا ہونا یقینی ہے تو مجھے امید ہے کہ جناب نقاد کم سے کم دس پندرہ مثالوں کا اشتراک اسی اتفاقی توارد کا نتیجہ سمجھیں گے۔ ایک بات اور بھی ہے جس کی وجہ سے توارد سے بچنا محال ہے۔ میر انیس کے یہاں بعض صنعتوں کی صرف ایک ہی مثال ملتی ہے۔ مثلاً صنعت جہلہ میں انھوں نے صرف ایک مقام پر تین بند کہے ہیں سا اب جتنے آدمی اس صنعت کی مثال میر صاحب کے کلام سے دیں گے وہ ان بندوں کے سوا کون چیز پیش کریں گے؟

مختصر یہ کہ اکیوانیس مثالوں میں سے صرف پندرہ بیس مثالیں ایسی رہ جاتی ہیں جن کے متعلق یہ شبہ کیا جا سکتا ہے کہ وہ بحر الفصاحت اور موازنہ یعنی دو مآخذ سے نقل کی گئی ہوں گی۔ کیا ایسی صورت میں جناب نقاد کا یہ فرمانا کہ میرے

مضمون میں صنعتوں کے تحت میں جو اشعار لکھے گئے ہیں وہ زیادہ تر موازنۂ انیس و دبیر اور بحر الفصاحت وغیرہ سے نقل کر لیے گئے ہیں، درست ہو سکتا ہے ؟

نقاد صاحب غالباً یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ میں خود صنعتوں سے مطلق ناواقف ہوں۔ محض موازنہ اور بحر الفصاحت کے مصنفوں کی تقلید میں کسی شعر کو کسی صنعت کی مثال قرار دے دیا ہے۔ انھوں نے اس بے بنیاد خیال کو اپنے مضمون میں در پردہ ظاہر کیا ہے، لیکن وہ چند باتیں جو ذیل میں لکھی جاتی ہیں، ان کے اس خیال کو صحیح نہ ثابت ہونے دیں گی۔

ا۔ میں نے ایک دو نہیں سترہ صنعتیں کلام انیس میں ایسی دکھائی ہیں جن کا ذکر موازنہ میں ہے نہ بحر الفصاحت میں۔

ب۔ میں نے صنعتوں کی مثالیں زیادہ تر ایسی دی ہیں جو ان کتابوں میں نہیں ملیں۔

ج۔ بعض صنعتوں کی مثالیں ان کتابوں میں ہیں مگر میرے مضمون میں نہیں ہیں۔

د۔ بعض مثالیں ایسی ہیں جن کو ان کتابوں کے مصنفوں نے کسی صنعت کے تحت میں لکھا ہے اور میں نے کسی دوسری صنعت کی مثال میں درج کیا ہے۔

ہ۔ مولانا شبلی نے یہ لکھ کر کہ "ہم اُن تمام صنعتوں کی کچھ کچھ مثالیں نقل کرتے ہیں جو میر صاحب کے کلام میں پائی جاتی ہیں" صرف نو صنعتوں کی مثالیں دی ہیں۔ میں نے ۲۳ صنعتیں ایسی نکالی ہیں جو ان کے یہاں نہیں ہیں۔ ان میں ۱۰ ایسی ہیں جو بحر الفصاحت میں بھی نہیں ہیں۔ باوجود اس کے میں نے اپنے مضمون میں لکھا ہے :-

"میرے نزدیک شعر کے محاسن میں صنعتوں کا درجہ بہت پست ہے۔ اس لیے میری نظر صنعتوں پر بہت کم پڑتی ہے۔ اس کے علاوہ میں نے صنعتوں کی تلاش میں کوئی خاص کاوش بھی نہیں کی۔ اس لیے میں ان تمام صنعتوں کی مثالیں پیش نہیں کر سکا جو انیس کے کلام میں موجود ہیں"

ظاہر ہے کہ یہ وہی شخص لکھ سکتا ہے جس کی نظر موازنہ اور بحر الفصاحت میں محدود نہ ہو۔

ان باتوں کے علاوہ میرے مضمون میں صنعتوں کے حسن استعمال اور استعمال صنائع میں میر انیس کے خصوصیات وغیرہ کی جو بحثیں ہیں ان پر جو منصف مزاج ایک

سرسری نظر بھی ڈالے گا اس کو قدم قدم پر اس امر کے ثبوت مل جائیں گے کہ میرا وہ مضمون ذاتی غور و فکر اور تلاش و تجسس کا نتیجہ ہے نہ کہ محض دوسروں کی خوشہ چینی کا۔

(۲) میرے مضمون میں مرزا دبیر کا ایک بند اور مشیر کی ایک بیت میر انیس سے منسوب کر دی گئی ہے لہٰذا حضرت نقاد کی رائے ہے کہ مجھے میر انیس کے مذاق سخن کا صحیح اندازہ نہیں ہے۔

اگر یہ تسلیم بھی کر لیا جائے کہ جو بند اور جو بیت زیر بحث ہے وہ میر انیس کے مخصوص رنگ سے کسی قدر مختلف ہے تو بھی اس بات سے یہ نتیجہ کیوں کر نکالا جا سکتا ہے کہ وہ انیس کا کلام نہیں ہے۔ کسی شاعر کے یہاں جو خصوصیات اکثر و بیشتر پائے جاتے ہیں انھیں کی بنا پر اس کے خاص رنگ کا تعین کیا جاتا ہے۔ لیکن یہ نہیں ہوتا کہ کسی شاعر کے کلام میں کوئی شعر بھی اس کے خاص رنگ کے خلاف نہ ہو۔ اگرچہ یہ ایسی کھلی ہوئی بات ہے کہ اس پر بحث کرنے اور مختلف مستند شاعروں کے یہاں سے اُن کے خاص مذاق کے خلاف مثالیں پیش کرنے میں وقت ضائع کرنے کی مطلق ضرورت نہیں تاہم احتیاطاً میر انیس کے چند بند ذیل میں نقل کیے جاتے ہیں جو یقیناً ان کے مخصوص رنگ سے بالکل الگ ہیں:۔

عباس علی کی مدح ؎

عین اس کا ہے وہ چشمہ کہ فیض اس کا ہوا عام
یہ علم کا آغاز ہے اور شرع کا انجام
با سے برکت اور الف اول اسلام
ہے سین سعادت یہ اسی نام کا اتمام
یہ اسم مقدس تو سعید ازلی ہے
اعلیٰ نہ ہو کیونکر کہ شریک اسکے علی ہے

محبان حسین کا مرتبہ ؎

قبروں سے وہ ہنستے ہوئے ہو دیں گے برآمد
اور پائیں گے قصر گہر و لعل و زبر جد
جو دشمن زہرا و علی ہے، وہ ہے مرتد
ایمانؔ کے عدد گن لو کہ ہیں حُبّ محمدؐ
کافر کا جگر سینے میں یاں خوف سے شق ہے
گر غور کرو نام علی کو تو بحق ہے

لؔہ ’ایمان‘ اور ’حب محمدؐ‘ کے عدد برابر ہیں۔ اسی طرح ’علی‘ اور ’بحق‘ کے عدد بھی برابر ہیں۔

عون و محمد کی جنگ ؎

جس طرف بھرے ہوئے رن میں جھپٹتے تھے وہ شیر ... مارے تلواروں کے کر دیتے تھے لاشوں کے ڈھیر
بچ کے آجاتا تھا گر کوئی زبردست و دلیر ... دونوں تشدید شجاعت سے اُسے کرتے تھے زیر
عزم بالجزم تھے کیا فاطمہ کے پیاروں کے
چھوٹی سی تیغوں سے دم بند تھے کفاروں کے

تلوار کی تعریف ؎

یہ ہے اسی تیغ کے آئینہ بنے گر ... عکس اُس میں جو دشمن کا نظر آئے تو بے سر
یا مے نہیں اب تک کسی جو ہر نے یہ جوہر ... ذکر اس کی برش کا جو سافر کے ہو لب پر
قطّاع طریق آئے تو وہ خوف سے ہٹ جائے
کیسی ہی کڑی راہ ہو اک آن میں کٹ جائے

پنج تن میں صرف امام حسین باقی رہ گئے ؎

کلک قضا جو محو کرے مصرع نخست ... بے سر ہے بیت، مصرع ثانی ہو گرچہ چست
پنجہ ہے تب تلک کہ رہیں انگلیاں درست ... مصرعے نہ چار ہوں تو رباعی ہو سخت سست
باقی رہیں نہ چار حدیں جب تو کیا رہا
اک مصرع مخمس آلِ عبا رہا

اس طرح کے بیسیوں بند میر انیسؔ کے یہاں موجود ہیں۔ اگر میں نے ایک وسیع النظر مصنف کے بیان پر اعتبار کرکے زیرِ بحث بند اور بیت کو میر انیسؔ کی طرف منسوب کر دیا تو اس سے یہ کیونکر ثابت ہوا کہ میں انیسؔ کے مذاقِ سخن سے ناواقف ہوں؟ یہ نتیجہ البتہ نکالا جا سکتا ہے کہ میں کلامِ انیسؔ کا حافظ نہیں ہوں، اور واقعہ بھی یہی ہے۔

(۴) صنعت مراعات النظیر کے تحت میں کئی مثالیں ایسی آگئی ہیں جن میں ایہام تناسب ہے۔ اُردو میں صنعت مراعات النظیر جو رعایت لفظی کے نام سے مشہور ہے، اس قدر عام ہے کہ اگر کوئی شخص تمام صنعتوں میں سے صرف ایک سے واقف ہو تو غالب

---

[۱] اس بند میں یہ الفاظ قابل لحاظ ہیں۔ پیش۔ زبر۔ تشدید۔ زیر۔ جزم۔ دیکھو روح انیس صفحہ ۱۵۱ بند ۴۰

ہے کہ وہ یہی صنعت ہو گی۔ نقاد صاحب کا مقصد اگر تنقیص کے سوا کچھ اور ہوتا تو شاید وہ اس غلطی کو میری ناواقفیت کی دلیل نہ قرار دیتے بلکہ قلم کی لغزش یا نظر کا سہو سمجھتے جس سے کسی بڑے سے بڑے اور محتاط سے محتاط اہل قلم کو بھی مفر نہیں اور جس کی مثالیں غالباً ہر مستند مصنّف کی تحریروں میں مل سکتی ہیں۔ پھر لطف یہ ہے کہ جس غلطی کو وہ اتنا ابھار کر دکھا رہے ہیں وہ حقیقت میں ایسی چیز بھی نہیں جس پر کوئی گرفت کی جا سکے۔ مندرجۂ ذیل اقتباسات بھی میرے اس بیان کی تائید کرتے ہیں:

مصنّف بحر الفصاحت نے ایہام تناسب کی بحث میں ایک مثال دینے کے بعد لکھا ہے:-

"یہ صنعت مراعات النظیر کے ملحقات سے ہے۔ چنانچہ مثال مذکور میں مجنوں کا ذکر لیلیٰ کی مناسبت سے مراعات النظیر ہے اور اس وجہ سے کہ یہاں اس سے دیوانہ کے معنی مراد ہیں نہ قیس ایہام تناسب ہے۔"

مصنّف المیزان صنعت مراعات النظیر کے بیان میں لکھتے ہیں:

"قابل تعریف اور پر لطف اس کی وہ قسم ہے جس کو ایہام التناسب کہتے ہیں۔"

مصنّف حیات دبیر مراعات النظیر کے متعلق فرماتے ہیں:

"صاحب حدائق البلاغۃ نے ایہام تناسب کو اسی سے ملحق بتایا ہے۔"

خود مصنّف حدائق البلاغۃ مراعات النظیر کا بیان کر کے لکھتے ہیں:-

"وملحق بایں صنعت است ایہام تناسب"

ان بیانات سے صاف ظاہر ہے کہ ایہام تناسب حقیقت میں صنعت مراعات النظیر ہی کی ایک خاص صورت کا نام ہے۔ بحر الفصاحت کی جو عبارت اوپر نقل کی گئی ہے اس سے ظاہر ہے کہ مصنف نے ایک ہی چیز کو صنعت مراعات النظیر کی مثال بھی قرار دیا ہے اور صنعتِ ایہام تناسب کی بھی۔ مصنّف المیزان نے تو ایہام تناسب کو صاف طور پر مراعات النظیر کی ایک قسم لکھ دیا ہے اور اپنی کتاب میں ایہام تناسب کی مثالیں مراعات النظیر ہی کے تحت میں لکھی ہیں۔ مولانا شبلی نے صنعت ایہام اور صنعت مراعات النظیر کی جو مثالیں دی ہیں ان میں کئی مشترک ہیں اور ایہام تناسب کی مثالیں مراعات النظیر ہی کے تحت میں لکھی ہیں۔ اس سے صاف ظاہر ہے

کہ وہ بھی ایہام تناسب کو مراعات النظیر ہی کی ایک صورت سمجھتے تھے۔
ان تمام فاضل مصنفین کی رائیں معلوم کرنے کے بعد غالباً جناب نقاد اپنے اعتراض کی سُبکی کا احساس کر سکیں گے۔

(۴) تجنیس مرفو کی مثال میں یہ شعر لکھا گیا تھا ؎

خالی نہ گیا وار کوئی تیغ دو سر کا
ہاتھ اڑ گئے گر پاؤں بچا کر کوئی سر کا

نقاد صاحب فرماتے ہیں کہ اس شعر میں تجنیس مرفو نہیں بلکہ تجنیس مرکب متشابہ ہے۔ یہ رائے انھوں نے غالباً اس بنا پر قائم کی ہے کہ بحر الفصاحت میں یہ شعر تجنیس مرکب متشابہ کی مثال میں لکھا گیا ہے۔ حضرت نقاد نے جہاں میرے اور مصنف بحر الفصاحت کے اختلاف کو دیکھ کر میری غلطی کا اعلان کر دیا وہاں یہ نتیجہ بھی نکال سکتے تھے کہ میں نے مصنف موصوف کی کورانہ تقلید نہیں کی۔ مولانا شبلی نے یہی شعر صنعت مراعات النظیر کی مثال میں لکھا ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ میں نے اُن کی تقلید بھی نہیں کی۔

تجنیس مرکب متشابہ اور تجنیس مرفو میں کچھ بہت فرق نہیں ہے۔ دونوں تجنیس تام کی دو صورتیں ہیں۔ دونوں میں الفاظ متجانس میں سے ایک مفرد اور ایک مرکب ہوتا ہے۔ فرق صرف اتنا سا ہے کہ تجنیس مرکب متشابہ میں لفظ مرکب دو کلموں سے بنتا ہے اور تجنیس مرفو میں لفظ مرکب میں ایک کلمہ پورا اور دوسرا کسی کلمے کا جزو ہوتا ہے۔ مندرجہ بالا شعر کو تجنیس مرفو کی مثال میں اس بنا پر لکھا گیا ہے کہ میں نے دو سر کو ایک لفظ مانا ہے اور پہلے مصرعے میں جو سر کا آیا ہے اس کے جزو اوّل کو لفظ دو سر کا جزو قرار دیا ہے۔ اگر میرا یہ خیال غلط ہو تو بھی یہ محض خطائے اجتہادی ٹھہرے گی، اصل مسئلے سے ناواقفیت ثابت نہ ہوگی۔

(۵) تجنیس زائد کی مثالوں میں یہ مصرع بھی لکھ دیا گیا تھا۔ ع چاہیں تو وہ سبیل کریں سلسبیل کو۔ حضرت نقاد فرماتے ہیں کہ سبیل اور سلسبیل میں تجنیس زائد نہیں ہے۔

اس میں شبہ نہیں کہ تجنیس زائد کی تعریف یہی کی گئی ہے کہ دو متجانس لفظوں میں سے ایک میں دوسرے سے صرف ایک حرف زائد ہو۔ میں نے بھی اس صنعت کی پہلی مثال یعنی۔ ع 'صاحب ہو تو ایسا جو مصاحب ہو تو ایسا'، ایسی ہی پیش کی ہے جو

اس تعریف پر ٹھیک اترتی ہے اور جو کسی دوسرے مصنف کے یہاں موجود بھی نہیں ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ میں تجنیس زائد کی تعریف سے ناواقف نہیں ہوں، لیکن جس طرح بعض صنعتوں کی ایسی صورتیں بیان کی گئی ہیں جو ان کی تعریف پر بالکل پوری نہیں اترتیں اور یہ صورتیں ان صنعتوں کے ملحقات میں شمار کی گئی ہیں اسی طرح میری رائے میں سبیل اور سلسبیل میں بھی ایسی تجنیس ہے جس کو تجنیس زائد ہی کی ایک صورت کہہ سکتے ہیں اور اس کے ملحقات میں شمار کر سکتے ہیں۔ بہرحال یہ میری ذاتی رائے ہے اس سے اختلاف کیا جا سکتا ہے۔ اگر حضرت نقّاد اس کو میری غلطی ثابت کرنے پر مصر ہوں تو بھی زیادہ سے زیادہ میری نگاہ کا چوک جانا ثابت ہوگا۔

(۶) میں نے ایک صنعت کا نام صنعت موازنہ لکھا ہے۔ جناب نقّاد فرماتے ہیں کہ ہم نے اس صنعت کا نام اب تک نہیں سُنا۔ گویا تمام علم اُن کے حدود سماعت میں محدود ہے۔ اس ضمن میں وہ مجھ سے مطالبہ کرتے ہیں کہ کسی ایسی کتاب کا نام بتاؤں جس میں اس صنعت کا ذکر ہو۔ میں ذیل میں بحرالفصاحت کے چند اقتباسات نقل کیے دیتا ہوں شاید ان سے صنعت موازنہ کی حقیقت واضح ہو جائے۔

ا۔ "سجع کی تعریف موازنہ پر صادق نہیں آتی کیونکہ اس میں فقروں کے آخری کلمات میں قافیہ موجود ہے اور اس میں مفقود۔"

ب: "صاحب تلخیص المفتاح کے نزدیک موازنہ اور سجع میں تباین ہے۔"

ج: "کتاب مثل السائر کا مصنف کہتا ہے کہ موازنہ سے سجع اخص ہے۔"

د: "مولوی امام بخش صہبائی اس مقام کی توضیح میں لکھتے ہیں کہ اس صنعت کی تعریف میں اگر الفاظ اخیرہ کے فقط وزن میں موافق ہونے سے یہ مراد ہے کہ موازنہ میں الفاظ اخیر کا حرف اخیر میں مخالف ہونا واجب ہے تو اس صورت میں سجع اور موازنہ میں تبائن ہوا یعنی نہ صنعت سجع کی موازنہ پر صادق آئے گی اور نہ صنعت موازنہ کی سجع پر۔ کیونکہ سجع میں حرف اخیر کی موافقت واجب ہے اور یہاں مخالفت اور اگر یہ مراد ہے کہ موازنہ میں وزن کی موافقت شرط ہے اور حرف اخیر کی موافقت شرط نہیں یعنی ہو ہو نہ ہو نہ ہو اس صورت میں ایک جگہ سجع اور موازنہ دونوں صادق آجاویں گے۔"

ہ "حدائق البلاغۃ کے مصنف سے تعجب ہے کہ موازنہ کی تعریف میں
آپ ہی لکھا ہے کہ موازنہ وہ ہے کہ دونوں فقروں کے الفاظ اخیر وزن میں
متحد ہوں اور حرف اخیر میں مختلف اور پھر اس کو ایک قسم سجع کی قرار دیا ہے۔"
و: اس تحقیق سے واضح ہوا کہ موازنہ سجع کی قسم نہیں ہے
ذ: جن لوگوں نے یہ توہم کیا ہے کہ موازنہ مختص نثر کے ساتھ ہے محض
بے جا ہے کیونکہ وہ نثر اور نظم دونوں میں جاری ہوتی ہے[1]
ان اقتباسات سے غالباً حضرت نقاد پر واضح ہو جائے گا کہ صنعت موازنہ تو
ایک چیز ہے۔ البتہ سجع موازنہ کا وجود مشتبہ ہے اور غالباً یہ بھی سمجھ میں آجائے گا کہ میرا
صنعت موازنہ کا ذکر کرنا تحقیق پر مبنی تھا نہ کہ ناواقفیت پر۔
(۷) صنعت ادماج کی مثال میں میں نے یہ مصرع بھی لکھا ہے ع اُس روز سے
اب تک کلمہ پڑھتے ہیں جنات : جناب نقاد فرماتے ہیں کہ اس مصرعے میں صنعت
ایہام ہے۔ دلیل یہ دیتے ہیں کہ ادماج میں پورے کلام سے دو معنی نکلتے ہیں اور ایہام
میں ایک کلمے کے دو معنی ہوتے ہیں اور مصرعے میں صرف کلمہ پڑھنے کے دو معنی ہیں۔
حضرت نقاد نے یہاں بھی اپنی عقل سے زیادہ اپنی آنکھوں پر اعتبار کیا اور
ادماج و ایہام کے فرق کے متعلق جو کچھ فن بدیع کی متعارف کتابوں میں لکھا ہوا دیکھا
اسے بے سمجھے ہوئے اپنے الفاظ میں دہرا دیا۔ مصنف بحرالفصاحت نے صنعت
ادماج کی مثال میں یہ دو شعر بھی لکھے ہیں ؎

زندگی میں تو وہ محفل سے اٹھا دیتے تھے
دیکھوں اب مر گئے پر کون اٹھاتا ہے مجھے

تیرا اقبال روز افزوں ہو جیسے مومن پہ فضل رحمانی

صاحب حدائق البلاغۃ نے اس صنعت کی مثال میں یہ شعر بھی لکھا ہے ؎

پیش ازیں گر فتنہ انگیختے در گوشۂ
چشم خوباں در زمانش فتنہ را بیند بہ خواب

---

[1] بحرالفصاحت صفحہ ۱۰۱۲ تا ۱۰۱۳

ان تینوں مثالوں میں صرف ایک ایک لفظ کے دو دو معنی ہیں یعنی "اٹھاتا ہے" "مومن" "خواب" مگر باوجود اس کے فاضل مصنفوں نے ان کو صنعت ادماج کی مثال قرار دیا ہے۔ اگر جناب نقاد صنعت ایہام اور صنعت ادماج کے فرق پر خود غور فرماتے تو شاید وہ سمجھ لیتے کہ جملے میں ایک کلمے کے معنی بدل جانے سے پورے جملے کا مفہوم بدل جاتا ہے۔ اس لیے یہ کہنا کہ ایہام میں ایک کلمے کے دو معنی ہوتے ہیں اور ادماج میں پورے جملے کے دو معنی ہوتے ہیں بہ ظاہر کوئی معنی نہیں رکھتا اور ایہام اور ادماج کا فرق ظاہر نہیں کرتا بلکہ ان دونوں صنعتوں کو ایک کیے دیتا ہے۔ حقیقت میں فرق یہ ہے کہ ایہام میں ایک کلمے کے دو معنی ہوتے تو ہیں لیکن مراد قائل صرف ایک ہی معنی ہوتے ہیں۔ دوسرے معنی کو اس کلام میں کوئی دخل نہیں ہوتا۔ اگر ایک ہی جملے میں کسی کلمے کے دو معنی ہوں اور دونوں معنی لیے جا سکتے ہوں تو وہاں صنعت ایہام نہ ہوگی بلکہ صنعت ادماج ہوگی جیسا کہ اوپر نقل کی ہوئی مثالوں سے بھی ظاہر ہے۔

(۸) میں نے انیس کے کلام سے چار مثالیں ایسی صنعتوں کی پیش کی تھیں جن کا کوئی نام اب تک معین نہیں ہے۔ حضرت نقاد نے ان میں سے ذیل کی صرف دو مثالوں کا ذکر اس طرح کیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ میں نے کل دو ہی مثالیں پیش کی ہیں۔

ع تازی کو تیز کرکے یہ غازی نے دی صدا

ع دہشت تھی کہ وحشت کو ہرن بھول گئے تھے

یہ غلط فہمی پیدا کرنے کے بعد فرماتے ہیں کہ پہلے مصرعے میں تجنیس لاحق اور دوسرے میں تضمین المزدوج ہے۔ اسی سلسلے میں آپ نے یہ جملے بھی تحریر فرمائے ہیں:۔

"آپ نے خود بھی ان دونوں صنعتوں کی مثالیں لکھی ہیں لیکن نہ معلوم آپ کس بنا پر ان مصرعوں کو ان کے تحت میں جگہ نہ دے سکے۔"

اگر جناب نقاد ذرا وسعت نظر سے کام لیتے تو مجھ کو ان صنعتوں سے ناواقف قرار دینے کی جرأت نہ کر سکتے اس لیے کہ موازنۂ انیس و دبیر میں تجنیس لاحق کی ایک مثال بھی نہیں ہے۔ بحر الفصاحت میں کلام انیس سے صرف ایک مثال لی گئی ہے اور میں نے اپنے مضمون میں چھ مثالیں دی ہیں۔ تضمین المزدوج کی بھی موازنہ میں

کوئی مثال نہیں۔ بحرالفصاحت میں بھی کوئی مثال انیس کے کلام سے نہیں دی گئی۔ لیکن میں نے اپنے مضمون میں اس صنعت کی پانچ مثالیں دی ہیں کیا اس صورت میں کوئی شخص یہ کہہ سکتا ہے کہ میں نے ان صنعتوں کی مثالیں بغیر سمجھے ہوئے نقل کر دیں؟

حضرت نقاد فرماتے ہیں کہ اس مصرعے میں ع "تازی کو تیز کر کے یہ غازی نے دی صدا" تجنیس لاحق ہے۔ غالباً ان کی نظر صرف "تازی" اور "غازی" پر پڑی اور ایک تعبیر الفظ جس نے کلام کے حسن میں اچھا خاصا اضافہ کیا ہے یعنی لفظ "تیز" اس کو نظر انداز کر دیا۔ اس مصرعے کو پڑھیے اور دیکھیے کہ لفظ "تازی" ایک طرف "تیز" سے تعلق رکھتا ہے اور دوسری طرف لفظ "غازی" سے اور اس کے اسی دوطرفہ تعلق نے کلام میں وہ حسن یا صنعت پیدا کر دی ہے جس کا نام اگر کچھ ہو بھی تو تجنیس لاحق ہرگز نہیں۔

اس مصرعے میں ع۔ "دہشت تھی کہ وحشت کو ہرن بھول گئے تھے"۔ "دہشت" اور "وحشت" کو ہم قافیہ دیکھ کر حضرت نقاد نے یہ فیصلہ صادر فرما دیا کہ اس میں صنعت تضمین المزدوج ہے۔ لیکن اس باریکی تک ان کی نظر نہ پہنچی کہ یہ دونوں لفظ صرف ہم قافیہ ہی نہیں ہیں بلکہ ان دونوں میں ایک خاص طرح کی تجنیس ہے جو لاحق سے بہت ملتی ہوئی ہے کیونکہ ان دونوں لفظوں کے ابتدائی حروف مختلف ہیں اور ان کے بعد ایک حرف ایسا ہے کہ متحد المخرج ہے۔ یعنی اگر ان لفظوں کے تلفظ کا خیال کریں تو ان میں تجنیس لاحق ہے، اور اگر رسم الخط کا لحاظ کریں تو تجنیس لاحق کی معینہ تعریف سے اس میں ایک ذرا سا فرق ہے، اور یہ ایک ایسی صنعت ہے جس کا نام مقرر نہیں ہوا۔

آخر میں نقاد صاحب لکھتے ہیں کہ

"اس مضمون میں اس قسم کی اور بھی غلطیاں موجود ہیں"

بہتر ہوتا کہ اسی سلسلے میں وہ ان کو بھی ظاہر فرما دیتے کہ میں لگے ہاتھوں ان پر بھی ایک نظر ڈال جاتا اور میری غلطیوں کی اصلاح یا حضرت نقاد کی غلط فہمیوں کا ازالہ ہو جاتا۔

میر انیسؔ کی غزل گوئی

میر انیسؔ نے عام دستور کے موافق شاعری غزل سے شروع کی۔ ان کے والد میر خلیقؔ مرثیہ گوئی کے علاوہ غزل گوئی کے بھی استاد سمجھے جاتے تھے۔ رندؔ اور رشکؔ جب تک فیض آباد میں رہے اپنی غزلوں پر میر خلیقؔ سے اصلاح لیتے رہے۔ لکھنؤ میں آنے کے بعد رشکؔ ناسخؔ کے اور رندؔ آتشؔ کے شاگرد ہو گئے[۲]۔ میر انیسؔ نے بھی اپنی غزلوں پر میر خلیقؔ سے اصلاح لی ہوگی۔ مرزا قادر بخش صابرؔ دہلوی نے انیسؔ کے بارے میں لکھا ہے:

"غزل گوئی میں دست گاہ تمام اور قدرت مالا کلام ہے[۳]"

اور ان کی غزل کا یہ مطلع بھی نقل کیا ہے ؎

ہوا ہے، ابر ہے، ساقی ہے، مے ہے   پر اک تو ہی نہیں، افسوس، ہے ہے

ناسخؔ کا قول ہے کہ انیسؔ:

"سوائے مرثیے کے کسی اور صنف میں مطلق دخل نہیں رکھتے[۴]"

مگر انیسؔ کی غزلوں کے تین شعر نقل کر کے اپنے قول کو خود ہی رد کر دیا ہے، ان تین شعروں میں ایک تو وہی مطلع ہے جو مرزا صابرؔ دہلوی نے اپنے تذکرے میں لکھا ہے اور اوپر نقل کیا جا چکا ہے۔ باقی دو شعر اس غزل کے ہیں جو کلب حسین خاں نادرؔ نے اپنے مجموعۂ مخمسات مسمّٰی بہ دیوانِ غریب میں درج کی ہے اور یہاں نقل کی جاتی ہے[۵]

وجد ہو بلبل تصویر کو جس کی بو سے
اس سے گل رنگ کا دعویٰ کرے پھر کس سے

---

۱ مطبوعہ ماہ نامہ آج کل، دہلی۔ جون ۱۹۷۱ء۔ ۲ خوش معرکہ زیبا قلمی۔
۳ گل دستہ عشق ص ۲۶۔ ۴ گلستان سخن ص ۱۳۵۔
۵ سخن شعرا ص ۵۶

شمع کے رونے پہ بس صاف ہنسی آتی ہے
آتش دل کہیں کم ہوتی ہے چار آنسو سے

کس سے اے شوق ہوئی رات کو ہاتھا پائی
نورتن آج جو ڈھلکے ہیں ترے بازو سے

کل تو آغوش میں شوخی نے ٹھہرنے نہ دیا
آج کی شب تو نکل جاؤ مرے قابو سے!

ایک دن وہ تھا کہ تکیہ تھا کسی کا زانو
اب سر اٹھتا ہی نہیں اپنے سرِ زانو سے

نزع میں ہوں مری مشکل کرو آساں یارو
کھولو تعویذِ شفا جلد مرے بازو سے

شوخیٔ چشم کا تو کس کی ہے دیوانہ انیس
آنکھیں ملتا ہے جو یوں نقش سمِ آہو سے[1]

تذکرۂ بزمِ سخن کے مولف نے انیس کو مرثیہ گوئی میں شہرۂ آفاق اور مرثیہ خوانی میں یگانہ و طاق لکھ کر ناسخ کی طرح یہ لکھا ہے کہ:

"اما بر دیگر اصنافِ سخن دستے نہ داشت"

پھر ناسخ کے پیش کیے ہوئے غزل کے دو شعروں میں سے ایک شعر پیش کر کے ناسخ کی طرح اپنے قول کو خود رد کر دیا ہے۔[2]

آغا اشہر نے اس شعر کو بھی میر انیس سے منسوب کیا ہے ؎

لکھ کر زمیں پہ نام ہمارا مٹا دیا ان کا تو کھیل خاک میں ہم کو ملا دیا[3]

سعادت خاں ناصر نے تذکرۂ خوش معرکۂ زیبا میں میر انیس کے حال میں لکھا ہے:

"عالم شباب میں چندے مشقِ غزل گوئی رہی اور اصلاح اس کی اپنے پدرِ بزرگوار سے لی۔ مگر اب زبان تائب اور دل مرثیہ گوئی پر راغب۔ یہ دو تین شعر

---

[1] دیوان غریب ص۲۱ ۔ [2] بزمِ سخن ص۱۹ ۔ [3] حضرت رشید ص۶۵

معرفت میر علی اوسط صاحب کے ہاتھ آئے ہے

یہی باعث ہے اس بے رحم کے آنسو نکلنے کا
دھواں لگتا ہے آنکھوں میں کسی کے دل کے جلنے کا

رہا تن میں نہ خوں باقی گیا موسم جوانی کا
بشتاب آخر ہوا روغن چراغ زندگانی کا

جو میں رگڑا اثر ترے پاؤں پہ مرادفعتاً گیا ادھر
یہ خواص صندل سُرخ ہو مری جان رنگ حنا نہیں[1]

راقم نے پہلے شعر کا مصرع اولیٰ معتبر بزرگوں سے یوں سُنا "کھلا باعث یہ اس بے درد کے آنسو نکلنے کا" تیسرے شعر میں "میں رگڑا" انیس کی زبان نہیں ہے۔ ممکن ہے بالکل ابتدائی مشق کا کلام ہو۔

تذکرہ خوش معرکۂ زیبا کا جو قلمی نسخہ پٹنے میں ہے اس کے حاشیے پر یہ عبارت ملتی ہے:

"عہد شباب میں جب کہ فیض آباد میں تھے اوائل میں چند غزلیں بھی کہی ہیں جب سے لکھنؤ تشریف لائے، شوق مرثیہ گوئی کا ہوا۔ وہ سب غزلیں یک قلم دھو ڈالیں، نسیاً منسیاً کیں..... غزل میر صاحب کی صفت عنقا نایاب ہے۔ بہت تلاش سے ایک غزل دست یاب ہوئی ہے"

شہید عشق ہوئے قیس نام ور کی طرح
جہاں میں عیب بھی ہم نے کیے ہنر کی طرح

کچھ آج شام سے چہرہ ہے فق سحر کی طرح
ڈھلا ہی جاتا ہوں فرقت میں دوپہر کی طرح

سیاہ بختوں کو یوں باغ سے نکال اے چرخ
کہ چار پھول تو دامن میں ہوں سپر کی طرح

تمام خلق ہے خواہانِ آبرو یارب
چھپا مجھے صدف قبر میں گہر کی طرح

---

[1] خوش معرکۂ زیبا قلمی

تجھی کو دیکھوں گا جب تک ہیں برقرار آنکھیں
مری نظر نہ پھرے گی تری نظر کی طرح

انیسؔ یوں ہوا حال جوانی و پیری
بڑھے نہ تھے نخل کی صورت گرے ثمر کی طرح

اس غزل کے بعد یہ دو شعر بھی لکھے گئے ہیں ؎

خموش اے بلبل شوریدہ اس میں کیا ہے بس میرا
یہ اپنی اپنی قسمت ہے چمن تیرا قفس میرا

بہے ہیں یوں یہ در دریا کے اندر
کہ ششدر ہو گئی ستہ سکندر

اخبار صدائے دون، دہرہ دون مورخہ ۲۱ جنوری ۱۹۲۹ء میں میر انیسؔ کی ایک غزل شائع کی گئی ہے، جس کے ابتدائی دو شعر تو وہی ہیں جو خوش معرکہ زیبا کے نسخۂ پٹنہ سے اوپر نقل کیے گئے ہیں۔ اس کے بعد تین شعر اور ہیں ؎

ہماری قبر پہ کیا احتیاج عنبر و عود
سلگ رہا ہے ہر اک استخواں اگر کی طرح

نحیف و زار ہیں کیا زور باغباں سے چلے
جہاں بٹھا دیا بس رہ گئے شجر کی طرح

تمہارے حلقہ بہ گوشوں میں ایک میں بھی ہوں
پڑا رہے یہ سخن کان میں گہر کی طرح

آخری شعر ذرا سے لفظی تغیر کے ساتھ جلالؔ کی ایک غزل میں بھی موجود ہے۔
ایک قلمی بیاض یا کشکول چمنستانِ بلاغت میں لکھا ہے

"مطلع بہ طور میاں انیسؔ مرحوم ؎

مجھے ثبات نہیں ایک دم شرر کی طرح
ٹپکنے پر ہے دل مضطرب ثمر کی طرح"

اور تیرہ ۱۳ شعر کی میر انیسؔ کی غزل نقل کی ہے جس میں سات شعر تو وہی ہیں جو اوپر آچکے

ہیں اور یہ شعر یہ ہیں ؎

تم اس جہاں میں وہ بلقیس ہو کر خط جو لکھو
تو سر پہ رکھ لے سلیماں ہما کے پر کی طرح

نہیں ہیں کام کے قابل اٹھائے کون ہمیں
گرے ہیں خاک پہ سوکھے ہوئے شجر کی طرح

بلاؤ بھیجیے دوری ہے آپ کے نزدیک
ابھی پہنچتے ہیں ہم ڈاک میں خبر کی طرح

خدا رکھے تجھے آباد خلق میں اے قبر
کہ سوئے پاؤں کو پھیلا کے اپنے گھر کی طرح

بتا تو دیجیے صاحب کہاں کا بوسہ لیں
دہن بھی آپ کا ملتا نہیں کمر کی طرح

[یہ مصرع پڑھا نہیں گیا]
کہ بند بند کو باندھے ہوں نیشکر کی طرح

اور مقطع ذرا سے لفظی تغیر کے ساتھ یوں لکھا گیا ہے ؎

انیسؔ یہ ہوا حال جوانی و پیری
بڑھے شجر کی طرح اور گرے ثمر کی طرح

سید علی حیدر نظم طباطبائی شرح دیوانِ غالب میں رقم طراز ہیں:
"میر انیسؔ مرحوم کے سامنے ایک صاحب نے یہ مصرع پڑھا ع
چیختے چیختے بلبل کی زباں سوکھ گئی

میر صاحب نے یہ مصرع لگا دیا ؎

عرقِ گل ہے مناسب اُسے دینا صیاد
چیختے چیختے بلبل کی زباں سوکھ گئی

اس کا چرچا لکھنؤ میں ہوا، اکثر لوگوں نے طبع آزمائی کی[1]"
افضل حسین ثابت مصنف حیاتِ دبیرؔ نے اپنے خط بہ نام حامد علی خاں

---

[1] شرح دیوان غالب ص۱۱۔

بیرسٹر مورخہ ۱۶ / اپریل ۱۹۱۲ء میں میر انیس کا یہ مطلع نقل کیا ہے ؎

نہ روکا ہم کو پھولوں نے چلے خالی ہی گلشن سے
گلوں سے خار ہی بہتر کہ لپٹے آ کے دامن سے[1]

مولوی مہدی حسن رضوی[2] نے اپنے والد مولوی حامد علی صاحب سے میر انیس کی غزل کے متعدد اشعار سُنے تھے، جن میں سے صرف ایک شعر یاد رہ گیا ؎

پہلے سے ہلال جھک گیا ہے
آمد آمد کمال کی ہے

انھیں مولوی مہدی حسن نے میر امجد حسین شاگرد میر مونس سے میر انیس کی ایک غزل کا یہ مطلع سنا تھا ؎

چُن کے افشاں نظر اس مہ نے جو کی تاروں پر
آسماں شام سے لوٹا کیا انگاروں پر

سیّد محمد عباس جنوں لکھنوی نے اپنے استاد نامی شاعر اور مرثیہ گو سیّد محمد کاظم جاوید سے میر انیس کا یہ شعر سنا تھا ؎

ہلال و ماہ دونوں ہیں تری تصویر کے خاکے
وہ نقشہ ہے لڑکپن کا یہ صورت ہو جوانی کی

مندرجۂ ذیل اشعار بھی میر انیس سے منسوب کیے جاتے ہیں ؎

---

[1] یادگارِ حامد ص ۱۸۲۔ [2] لکھنؤ کے ذی علم، ذی اثر اور حکام رس بزرگ خان بہادر نواب مولوی مہدی حسن رضوی نے ۲۲ / جنوری ۱۹۵۵ء کو بچاسی برس کی عمر میں انتقال کیا۔ ان کے والد میر حامد علی میر انیس سے انتہائی عقیدت رکھتے تھے اور روزانہ رات کو دو تین گھنٹے ان کی صحبت میں صرف کرتے تھے۔ وہ میر انیس کا بہت ذکر کرتے تھے۔ مولوی مہدی حسن کو چند باتیں یاد رہ گئی تھیں جو انھوں نے آج سے کوئی تیس برس پہلے میرے دریافت کرنے پر بیان کر دی تھیں۔ ایک مدت کے بعد میں نے ان کا بیان ایک مضمون کی صورت میں ہفت روزہ سرفراز لکھنؤ مورخہ ۹ / نومبر ۱۹۶۵ء میں شائع کر دیا تھا۔ مضمون کا عنوان ہے "کچھ میر انیس کے بارے میں" اور ذیلی سرخی ہے "ایک عقیدت مند رفیق کا بیان"۔

دل لے لیا ہے یار نے مٹھی میں بند ہے
کھلتا نہیں، پسند ہے یا ناپسند ہے

جب مسیحا دشمنِ جاں ہو تو ہو کیوں کر علاج
کون رہبر ہو سکے جب خضر بہکانے لگے

دکھ کے منھ سو گیا ان آتشیں رخساروں پر
دل کو چین آیا تو نیند آ گئی انگاروں[1] پر

سید زوار حسین زائر مرحوم جو میر انیس کی بہن کے حقیقی پوتے تھے، انھوں نے مجھ کو چند نہایت قابل قدر کاغذات عنایت کیے تھے جو ان کو اپنی دادی سے وراثت میں ملے تھے۔ ان کاغذات میں ایک پرچے پر غزل غالباً میر انیس کے ہاتھ کی لکھی ہوئی ہے۔ اس غزل کا ایک شعر یہ تھا ؎

دیکھ کر شکل اس کی اسکندر کو یہ حیرت ہوئی
بن گیا آئینۂ تصویرِ پشتِ آئینہ

اس شعر کے پہلے مصرعے کو ذرا سا بدل کر اور مونس کا تخلص ڈال کر غزل کا مقطع کر دیا ؎

دیکھ کر شکل اس کی مونس کو زبس حیرت ہوئی
بن گیا آئینہ تصویرِ پشتِ آئینہ

یہ طولانی غزل ذیل میں نقل کی جاتی ہے ؎

کھنچتے ہیں آپ وہ تصویرِ پشتِ آئینہ[2]
ہے چمک پر ان دنوں تقدیرِ پشتِ آئینہ

---

[1] اسی زمین میں آتش کا مطلع ہے ؎ پڑ گئی آنکھ جو ان آتشیں رخساروں پر + لوٹتے کبک نظر آ گئے انگاروں پر۔ [2] تصویر پشت آئینہ: میرا سن اس وقت ۱۹۸۰ء میں ستتر برس کا ہے۔ دس بارہ برس کی عمر میں مجھ کو اپنی دادی صاحبہ مرحومہ کے سامان میں ایک منھ دیکھنے کا آئینہ ملا تھا۔ قلعی دار جلی شیشے کی پشت پر ایک ہی چوکھٹے میں ایک دوسرا شیشہ تھا، جس میں سنہری اور رنگین تصویر ایک درخت کی تھی جس پر چڑیاں بیٹھی ہوئی تھیں۔ یہ تھی تصویر پشت آئینہ۔ غالباً اس زمانے میں آئینے (باقی حاشیہ صفحہ ۱۵۹ پر)

گر پسند آئے تمھیں تصویر پشت آئینہ
روسے ہو جائے سوا توقیر پشت آئینہ

زلف پیچاں کو رخ روشن کے پیچھے دیکھ کر
میں نے یہ جانا کہ ہے زنجیر پشت آئینہ

زانوے خوش بو پہ رکھ کر تم نے دیکھا ہے جو منھ
کیا جھکتے ہیں گل تصویر پشت آئینہ

سلسلہ حیرت زدوں کی قید کا اچھا نہیں
کہہ رہی ہے صاف یہ زنجیر پشت آئینہ

دور کیا ہے گر تمھارے دیکھنے کے شوق میں
پھوٹ نکلے اس طرف تصویر پشت آئینہ

عہدۂ آئینہ داری تو اگر بخشے اُسے
گردنِ یوسف میں ہوں زنجیر پشت آئینہ

گر نظر آئے تمھارے گلشن رُخ کی بہار
مثل طوطی بول اٹھے تصویر پشت آئینہ

حال اسکندر نظر آجائے جس کو دیکھ کر
چاہیے اس رنگ کی تصویر پشت آئینہ

ہنس کے وہ بولے جو بکھرے پیٹھ پر چوٹی کے بال
دیکھ گر دیکھی نہ ہو زنجیر پشت آئینہ

سخت حیراں ہوں کہ روے یار دیکھا کس طرح
.... تصویر پشت آئینہ

اس کے پیچھے رات دن رہتا ہوں میں حیرت زدہ
بن گیا ہوں آج کل تصویر پشت آئینہ

(بقیہ صفحہ ۱۵۸)

کی زینت کے لیے اس کے ساتھ ایسا با تصویر شیشہ لگانے کا عام رواج تھا اور آئینے کو لٹکانے کے لیے اس کی پشت پر ایک زنجیر بھی ہوتی تھی۔

دیکھتے ہیں آپ اس کو اور مجھے آتا ہے رشک
ڈھانپ دیجیے دیدۂ تصویرِ پشتِ آئینہ

اس کو آئینہ دکھانے میں عجب نقشہ ہوا
بن گیا حیرت سے میں تصویرِ پشتِ آئینہ

آپ کوئی بات تو کہیے لبِ جاں بخش سے
بول اٹھے گی ابھی تصویرِ پشتِ آئینہ

دولتِ عکسِ رخِ محبوب سے محروم ہے
پڑھ لیا ہم نے خطِ تقدیرِ پشتِ آئینہ

آپ کے چہرے سے ہم چشمی کا دعوا واہ واہ
لائیے کوڑا پے تعزیرِ پشتِ آئینہ

شاہ نصیر دہلوی مشکل طرحوں میں غزل کہنے میں بڑے مشاق تھے۔ وہ ایک زمانے میں لکھنؤ آئے تو یہ طرح کی 'تصویرِ پشتِ آئینہ'، 'تقدیرِ پشتِ آئینہ'۔ اس طرح میں اکثر شعرا نے طبع آزمائی کی، جن میں سے بارہ شاعروں کی ہم طرح غزلیں تذکرۂ سراپا سخن میں درج کر دی گئی ہیں۔ ان شاعروں کے تخلص یہ ہیں۔ وزیر، رشک، افضل، نصیر، ثاقب، آباد؛ شاگردان ناسخ، محسن؛ شاگرد وزیر، شمس؛ شاگرد ثاقب، امانت؛ شاگرد دلگیر، جوہر؛ شاگرد نسیم دہلوی، اسیر و غافل؛ شاگردان مصحفی۔ ان غزلوں کے علاوہ مسلم عظیم آبادی کا بھی ایک شعر اسی طرح میں ہے۔ امانت کو فخر تھا کہ شیر، زنجیر، تکبیر، گلگیر، تدبیر کے قافیے اُن کے سوا کسی اور نے نہیں کہے۔[1]

اس زمین اور ان غزلوں کا بڑا چرچا رہا ہوگا اور اس زمین میں غزل کہنا شاعر کی قادر الکلامی کا امتحان قرار پایا ہوگا۔ اس صورتِ حال سے میر انیس کا چھوٹا ہوا شوق بھر ابھرا اور انھوں نے اس مشکل زمین میں بہت سے شعر کہہ ڈالے۔ لیکن چونکہ خود غزل گوئی ترک کر چکے تھے اور غزل گویوں سے مقابلہ کرنا منظور نہ تھا، اس لیے ایک شعر کا پہلا مصرع بدل کر اس میں میر مونس کا تخلص ڈال دیا۔ بہرحال یہ قیاسات

---

[1] سراپا سخن ص ۳۳۱-۳۳۵۔

ہیں۔ اصل حقیقت تک پہنچنے کی بہ ظاہر کوئی صورت نہیں ہے۔
انیس کے غزل گوئی ترک کرنے کے بارے میں آزاد نے لکھا ہے کہ میر خلیق نے انیس کی ایک غزل سن کر کہا کہ "اب اس غزل کو سلام کرو۔"[1] اس جملے کے دو معنی ہو سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ اسی زمین میں سلام کہو، دوسرے یہ کہ اب غزل گوئی ترک کرو۔ سعادت مند فرزند نے ان دونوں معنوں میں باپ کے حکم کی تعمیل کی۔ یہ کسی نے نہیں لکھا ہے کہ وہ کون سی غزل تھی۔ لیکن میر انیس کی ایک غزل کے چند شعر اور اسی طرح میں اُن کا ایک سلام ملتا ہے۔ غزل کے اشعار حسب ذیل ہیں ؎

اشارے کیا نگہ ناز دل رُبا کے چلے
ستم کے تیر چلے نیمچے قضا کے چلے

پکارے کہتی تھی حسرت سے نعش عاشق کی
صنم کدھر کو ہمیں خاک میں ملا کے چلے

مثالِ ماہیِ بے آب موجیں تڑپا کیں
حباب پھوٹ کے روئے جو تم نہا کے چلے

سلام میں چودہ شعر ہیں۔ چند شعر درج کیے جاتے ہیں ؎

گنہ کا بوجھ جو گردن پہ ہم اٹھا کے چلے
خدا کے آگے خجالت سے سر جھکا کے چلے

مقام یوں ہوا اس کارگاہ دنیا میں
کہ جیسے دن کو مسافر سرا میں آ کے چلے

ملا جنھیں انھیں افتادگی سے اوج ملا
انھیں نے کھائی ہے ٹھوکر جو سر اٹھا کے چلے

ملی نہ پھولوں کی چادر تو اہل بیت امام
مزار شاہ پہ لخت جگر چڑھا کے چلے

اس سلام کا مقطع بہت مشہور ہوا ؎

---

[1] آب حیات ص ۵۴۲۔

انیسؔ دم کا بھروسا نہیں ٹھہر جاؤ
چراغ لے کے کہاں سامنے ہوا کے چلے

قیاس کہتا ہے کہ شاید یہی میر انیسؔ کی آخری غزل ہو۔

میر خلیق کی طرح میر انیسؔ نے بھی اپنی غزلوں کو شہرت نہیں دی اور غالباً تمام غزلیں خود تلف کر دیں۔ غزل کے جتنے شعر اوپر نقل کیے گئے ہیں ان کے علاوہ کسی اور شعر کے وجود کا مجھ کو علم نہیں ہے۔ البتہ میر صاحب کے سلاموں میں ایسے بہت سے شعر ملتے ہیں جو غزل کی زینت کا باعث ہو سکتے ہیں۔ مولوی اشہری نے اپنی کتاب حیاتِ انیسؔ میں انیسؔ کے سلاموں سے متعدد غزلیں بنا کر پیش کی ہیں[1]۔ مگر ان میں تغزل کا خاص عنصر یعنی حسن اور عشق کے معاملات کا ذکر معدوم ہے۔ اس لیے کہ سلام کی متانت ان کے بیان کی متحمل نہیں ہو سکتی۔ مرثیوں میں تغزل کا موقع اور بھی نہ تھا مگر غزل کا مذاق عام طور پر دلوں میں ایسا بس گیا تھا کہ مرثیوں میں بھی تغزل کا محل پیدا کر لیا گیا، خاص کر تلوار کی تعریف میں جیسا کہ ذیل کی مثالوں سے ظاہر ہے ؎

چلنے میں مزہ قامتِ معشوقِ حسیں کا
انداز ہر اک ناب میں تھا چینِ جبیں کا

کیا قہر تھا شمشیر کے ابرو کا اشارہ
اک چشم زدن میں اسے مارا اسے مارا

کج ہو کے وہ چلنا، وہ ٹھہرنا، وہ چمکنا
شعلہ تھا خجل، گرد تھا بجلی کا چمکنا

ندی کے قریں خون کا دریا سا بہا تھا
کیا چال غضب تھی کہ ہر اک لوٹ رہا تھا

حوروں میں یہ گرمی نہ لگاوٹ یہ پری میں
بے دم کیا لاکھوں کو اسی عشوہ گری میں
چمک ایسی کہ حسینوں کا اشارہ جیسے

---

[1] حیاتِ انیسؔ ص ۱۴۳ تا ۱۴۸۔

بسمل ہوا جس کو پلک اس کی نظر آئی
اُٹھ کھیلیاں کرتی ادھر آئی اُدھر آئی

اس کرشمے سے وہ لیلیٰ ظفر راہ چلی
گہہ تھمی، گاہ رکی، گاہ بڑھی، گاہ چلی

زخم سینوں کے گریباں کی طرح پھٹتے تھے
چال کیا تھی کہ ہزاروں کے گلے کٹتے تھے

میر انیس کے غزل گوئی ترک کرنے کا سبب جو اوپر بیان کیا گیا ہے۔ یعنی ان کے والد میر خلیق کا حکم، وہ وقتی اور ظاہری سبب تو ہو سکتا ہے لیکن اصلی سبب تو وہ غیر معمولی ملکۂ شاعری تھا جس کا اظہار غالب نے یوں کیا ہے ؎

بہ قدرِ شوق نہیں ظرفِ تنگنائے غزل
کچھ اور چاہیے وسعت مرے بیاں کے لیے

بعض غزل گویوں اور غزل کے شعروں کے بارے میں میر انیس کے چند جملے جو ہم تک پہنچے ہیں وہ بھی سن لیجیے۔ محمد حسین آزاد نے ذوق کے بارے میں میر انیس کی رائے دریافت کی،

"فرمایا کہ میاں سید میر کے بعد پھر دلی میں ایسا شاعر کون ہوا ہے [1]"

ایک دن آزاد نے میر انیس کے سامنے ذوق کا یہ مطلع پڑھا ؎

کوئی آوارہ تیرے نیچے اے گردوں نہ ٹھہرے گا
مگر تو بھی اگر چاہے کہ میں ٹھہروں نہ ٹھہرے گا

میر صاحب نے یہ مطلع دو مرتبہ پڑھوایا اور کہا

"صاحب کمال کی یہ بات ہے کہ جو لفظ جس مقام پر اس نے بٹھا دیا ہے اسی طرح پڑھا جاوے تو ٹھیک ہوتا ہے نہیں تو شعر رتبے سے گر جاتا ہے [2]"

---

[1] آبِ حیات ص۴۸۰۔

[2] آبِ حیات ص۴۸۵۔

میر قربان علی سالک شاگرد غالب نے اپنی بیاض میں ۱۸۶۱ء کی یادداشت میں میر انیس سے اپنی ملاقات کا حال بیان کیا ہے اور اس سلسلے میں لکھا ہے،

"مرزا غالب کو یگانۂ فن کے لفظ سے یاد کیا اور ذوق و مومن کی نسبت فرمایا کہ ذوق شاہی دربار کے شاعر اور مومن اپنی طبیعت کے بادشاہ ہیں۔ پھر حکیم مومن خاں کا یہ شعر پڑھا ؎

نہ کچھ شوخی چلی بادِ صبا کی   بگڑنے میں بھی زلف اس کی بنا کی

پڑھنے کے بعد ایک چپ سی لگ گئی جیسے کوئی حسین صورت سامنے ہے اور ہوا سے اس کی زلف اڑ رہی ہے اور میر صاحب اس کو دیکھ دیکھ کر کلام کے مزے لے رہے ہیں۔ ایک روز فرمانے لگے دلّی کا کچھ کلام سناؤ۔ میں نے مرزا غالب کی یہ غزل پڑھی ؎

بازیچۂ اطفال ہے دنیا مرے آگے
ہوتا ہے شب و روز تماشا مرے آگے
ایماں مجھے روکے ہے تو کھینچے ہے مجھے کفر
کعبہ مرے پیچھے ہے کلیسا مرے آگے

پھر اپنی غزل پڑھی۔ اس کا ایک شعر یہ ہے ؎

دنیا میں مجھے خاک اڑانے نے ڈبویا
ہر بار نکل آتا ہے دریا مرے آگے

اس شعر پر فرمایا 'خوب کہا ہے' یہ کہہ کر فرمانے لگے 'لکھنؤ والے روکے ہے، کھینچے ہے نہیں بولتے'"[1]

شریف العلما اپنے خط مورخہ ۲۹ ذی الحجہ ۱۲۸۰ھ = ۲۱ مارچ ۱۸۶۱ء میں لکھتے ہیں کہ حیدر آباد میں ایک دن میر انیس نے میر تقی میر کے یہ دو شعر پڑھے ؎

تیری گلی میں ہم نہ چلیں اور صبا چلے
یونہی خدا جو چاہے تو بندے کا کیا چلے[2]

---

[1] حیات انیس ص ۲۵۴ تا ۲۵۵۔

[2] یہ شعر میر کا نہیں درد کا ہے۔ ادیب

تھمتے تھمتے تھمیں گے آنسو
رونا ہے یہ کچھ ہنسی نہیں ہے

میر انیس کے ایک عقیدت مند رفیق مولوی میر حامد علی کا ذکر اوپر آچکا ہے، ایک مرتبہ انھوں نے میر انیس کے سامنے یہ شعر پڑھا ؎

روشن ہے اس طرح دل ویراں میں داغ ایک
اجڑے نگر میں جیسے جلے ہے چراغ ایک

میر صاحب لیٹے تھے، یہ شعر سن کر اٹھ بیٹھے، ایک اُف کی اور فرمایا کہ اب میں بڑھاپے میں ایسے شعروں کی تاب نہیں لا سکتا، اس سن میں ایسے تیر نہیں کھا سکتا۔ پھر میر صاحب نے اس شعر کی شرح کے سلسلے میں فرمایا کہ پرانے زمانے میں جب کسی بستی پر شاہی عتاب نازل ہوتا تھا تو وہ بستی ویران کر دی جاتی تھی اور اس میں کسی نمایاں مقام پر ایک چراغ جلا دیا جاتا تھا۔

انیس و دبیر

ایک تقابل

اردو شاعری کی تاریخ کے ہر دور میں دو دو ممتاز شاعر ایسے ہوتے رہے ہیں جن کے کلام کا رنگ ایک دوسرے سے بہت مختلف تھا اور جن کی باہمی چشمکوں سے ادبی معرکے گرم ہوتے رہتے تھے۔ میر و سودا، مصحفی و انشا، ناسخ و آتش، انیس و دبیر، غالب و ذوق، داغ و امیر ان معرکوں کے خاص مردِ میدان تھے۔ انیس و دبیر کے معرکوں کا میدان سب سے زیادہ وسیع اور ان کی مدت سب سے زیادہ طویل تھی۔ اس وقت میں انھیں معرکوں کا کچھ حال سناؤں گا۔

دبیر کی مرثیہ گوئی لکھنؤ میں اور انیس کی فیض آباد میں شروع ہوئی۔ فسانۂ عجائب کی تصنیف کے وقت دبیر مرثیہ گوئی میں نام پیدا کر چکے تھے اور انیس کو یا تو شہرت حاصل ہی نہ ہوئی تھی یا فیض آباد سے نکل کر لکھنؤ تک نہ پہنچی تھی۔ رجب علی بیگ سرور نے فسانۂ عجائب کے دیباچے میں لکھنؤ کے ماہرینِ فن کا ذکر ایسی عبارت میں کیا ہے جس میں ان کے کئی پیش رو اور ہم عصر مرثیہ گویوں کے نام آگئے ہیں۔ وہ عبارت یہ ہے:

"مرثیہ گوئے بے نظیر میاں دلگیر صاف باطن، نیک ضمیر، خلیق، فصیح، مردِ مسکین، مکروہاتِ زمانہ سے کبھی افسردہ نہ دیکھا۔ اللہ کے کرم سے ناظمِ خوب، دبیر مرغوب، سکندر طالع، بصورت گدا، بارِ احسان۔ اہلِ دول کا نہ اٹھایا۔ عرصۂ قلیل میں مرثیہ و سلام کا دیوان کثیر فرمایا۔"

نشریۂ آل انڈیا ریڈیو، ۹ نومبر ۱۹۵۵ء۔ مطبوعہ (۱) ماہنامہ فروغ اردو لکھنؤ جنوری و فروری ۱۹۵۶ء
(۲) ہفتہ وار سرفراز، لکھنؤ، انیس نمبر، فروری ۱۹۷۲ء۔

اس عبارت میں اتنے مرثیہ گویوں کے نام موجود ہیں، دلگیر، ضمیر، خلیق، فصیح، مسکین افسردہ، کرم، ناظم، دبیر، سکندر، گدا، احسان۔ اس فہرست میں دبیر کا نام تو شامل ہے مگر انیس کا نہیں ہے۔

جب دبیر مرثیہ گوئی میں کافی شہرت حاصل کر چکے اُس وقت انیس نے فیض آباد سے سکونت ترک کر کے لکھنؤ میں قیام اختیار کیا، دبیر کی مرثیہ گوئی کا ڈنکا بج رہا تھا، اس نووارد کا کلام کون سنتا۔ انیس کے کلام کا رنگ بھی دبیر سے بالکل مختلف تھا۔ جو لوگ خیال بندی، جدت طرازی اور صنعت گری کے عادی ہو چکے تھے وہ انیس کے کلام کی سلاست، متانت اور واقعیت کی طرف ملتفت نہ ہو سکے۔ اُن کے پڑھنے کی مجلسوں میں سامعین کی تعداد بھی کم ہوتی تھی اور ان میں شوق کی کمی بھی محسوس ہوتی تھی۔ انیس نے اپنے ابتدائی کلام میں جابجا اس کا ذکر کیا ہے۔

ان کے کلام سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ایک جماعت ان کی مخالفت پر تلی ہوئی تھی۔ اسی زمانے میں انھوں نے ایک مناجات کہی تھی، جس کے چند مصرعے یہ ہیں ؎

اک طرف میں اور زمانہ اک طرف	جان شیریں مفت ہوتی ہے تلف
دیکھتا ہوں میں دلیس کوئی نہیں	میں تن تنہا ہوں بس کوئی نہیں

ایک مرثیے میں کہتے ہیں ؎

ناقدری مولا کی شکایت نہیں مولا	کچھ وقر باطل کی حقیقت نہیں مولا
تنہا ترے اقبال سے شمشیر بکف ہوں	سب ایک طرف جمع ہیں میں ایک طرف ہوں

اسی مرثیے کے مقطعے میں کہتے ہیں ؎

اب حق سے دعا مانگ کہ اے خالق کونین	حاسد ہیں بہت دل کو عطا کر تو مرے چین
ناحق ہے عداوت انھیں اس ہیچ مداں سے	بے تیغ کئے جاتے ہیں شمشیر زباں سے

یہ مخالف جماعت اگر انیس کی مجلس میں شرکت بھی کرتی تھی تو نہ تحسین کا کوئی کلمہ زبان سے نکالتی تھی نہ بین کے موقعے پر آواز سے گریہ کرتی تھی۔ ان لوگوں پر انیس کبھی کبھی طنز بھی کرتے تھے۔ مثلاً ؎

خاروں کے لیے رُخ طرف گل نہیں کرتے	تعریف خوش الحانی بلبل نہیں کرتے

خاموش ہیں گو شیشۂ دل چور ہوئے ہیں   اشکوں کے نکل پڑنے سے مجبور ہوئے ہیں

یا

انیسؔ ترے سخن کی ہے تاثیر انیسؔ   روتے ہیں مثل شمع جلنے والے

رفتہ رفتہ انیسؔ کے قدر دانوں کی تعداد بڑھتی گئی ۔ ان کی مجلسوں میں بہت مجمع ہونے لگا اور وہ اس کا اظہار مسرت اور فخر کے لہجے میں کرنے لگے ۔ فرماتے ہیں ؎

ماشاءاللہ چشم بد دور انیسؔ   مجلس میں جگہ نہیں ہے تل دھرنے کی

گل چیں تو بھلا چمن سنوارے ایسے   رضواں ہے فدا گل ہیں یہ سارے ایسے
کہتی ہے زمیں کبھی نہ دیکھے ہوں گے   گردوں نے بھی گنجان ستارے ایسے

ہر طبقے کے لوگ ان کی مجلسوں میں شریک ہونے لگے جن کی مدح انیسؔ یوں کرتے ہیں ؎

عابد سب ہیں خدا رسیدہ سب ہیں   بینا، صفتِ مردمِ دیدہ سب ہیں
گلزار ہے لکھنؤ انھیں پھولوں سے   چیدہ مجلس ہے، برگزیدہ سب ہیں

اب انیسؔ و دبیرؔ برابر کے استاد سمجھے جانے لگے لیکن دونوں کی شاعری کا رنگ جدا جدا تھا۔ اس لیے پورا شہر دو حصوں میں تقسیم ہو گیا۔ ایک گروہ دبیرؔ کو انیسؔ سے بہتر اور دوسرا انیسؔ کو دبیرؔ سے کہیں برتر سمجھتا تھا۔ یہ دونوں گروہ "انیسیے" اور "دبیریے" کہلاتے تھے۔

انیسؔ اور دبیرؔ ایک دوسرے کا جواب کہتے تھے اور ان کے ماننے والے اپنے پسندیدہ استاد کے کلام کی خوبیاں اور دوسرے کی خامیاں ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر پیش کرتے تھے اور اس طرح شہر بھر میں نقد سخن کا بازار گرم رہتا تھا۔ ان دونوں استادوں کے کلام سے ایسے چند مقامات پیش کیے جاتے ہیں جن میں بلا ارادہ توارد ہو گیا یا جو ارادہ کرکے ایک دوسرے کے جواب میں کہے گئے ہیں۔

جوابی کلام کی مختلف صورتیں ہیں۔ ایک صورت یہ ہے کہ ایک ہی مضمون کو دوسرے انداز سے ادا کیا۔ مثلاً دبیرؔ نے کہا ؎

برزخ کی صعوبات کٹے گی کیوں کر   تنہائی میں اوقات کٹے گی کیوں کر

غفلت میں دبیر صبح پیری ہوئی شام — دن رات ہوا رات کٹے گی کیوں کر

انیس نے اسی مضمون کو یوں ادا کیا ہے

دردو الم ممات کیوں کر گزرے — یہ چند نفس حیات کیوں کر گزرے
پیری کی تھکی دو پہر ڈھلی شکر انیس — اب دیکھیں لحد کی رات کیوں کر گزرے

دبیر نے کہا ہے

گھر اپنا اجاڑ کر بسایا تجھ کو — ڈھانپا جو کفن سے منہ دکھایا تجھ کو
اے قبر کہاں کہاں نہ کی تیری تلاش — جب خاک میں مل گئے تو پایا تجھ کو

انیس نے یہی مضمون یوں ادا کیا ہے

مر مر کے مسافر نے بسایا ہے تجھے — رُخ سب سے پھرا کے منہ دکھایا ہے تجھے
کیوں کر نہ لپٹ کے تجھ سے سوؤں اے قبر — میں نے بھی تو جان دے کے پایا ہے تجھے

دبیر نے کہا ہے

خورشید سر شام کہاں جاتا ہے — روشن ہے دبیر یہ جہاں جاتا ہے
ہاں قبلے کی جانب تو ہے قبر حیدر — یہ شمع جلانے کو وہاں جاتا ہے

انیس نے کہا ہے

جو روضے پہ باریاب ہو جاتا ہے — وہ اوج میں لاجواب ہو جاتا ہے
جلتا ہے جو شب کو قبر مولا پہ چراغ — وہ صبح کو آفتاب ہو جاتا ہے

دوسری صورت یہ ہے کہ ایک ہی مضمون کا دوسرا پہلو پیش کیا۔ مثلاً:

دبیر نے کہا ہے

آج آئے ہیں کل کوچ کی تیاری ہے — غفلت میں کٹی عمر یہ ہشیاری ہے
دنیا ہے عجب مقام حیرت نہ کھلا — یہ عالم خواب ہے کہ بیداری ہے

انیس نے کہا ہے

جس شخص کو عقبیٰ کی طلب گاری ہے — دنیا سے ہمیشہ اسے بیزاری ہے
اک چشم میں کس طرح سمائیں دونوں — غافل وہ خواب ہے یہ بیداری ہے

انیس نے کہا ہے

کس منہ سے کہوں لائق تحسیں ہوں میں — کیا لطف جو گل کہے کہ رنگیں ہوں میں

ہوتی ہے حلاوتِ سخن خود ظاہر　　کہتی ہے کبھی شکر کہ شیریں ہوں میں؟

دبیر نے کہا ؎

شیریں سخنی پہ موردِ تحسیں ہوں　　واللہ نہ عیب بیں نہ نکتہ چیں ہوں
سکتے میں ہے میرے سخن شیریں سے　　شکر کا ہے کیا منھ جو کہے شیریں ہوں

تیسری صورت یہ ہے کہ ایک ہی بات کے لیے نئی تشبیہ یا نئے استعارے سے کام لیا۔ مثلاً:

دبیر نے کہا ؎

اشکِ غمِ شبیرؑ دُرِ یکتا ہے　　ہر دیدۂ حق بیں سے یہ دُر پیدا ہے
بے اشکِ عزا آبروئے چشم ہے خاک　　پانی نہ ہو جس میں وہ کنواں اندھا ہے

انیس نے کہا ؎

مجلس میں عجب بہار چشمِ تر سے ہے　　ہر لخت جگر رشکِ گلِ احمر ہے
اشکوں سے ہو کیوں نہ آبرو آنکھوں کی　　بے قدر ہے وہ صدف جو بے گوہر ہے

دبیر نے کہا ؎

حیرانِ مضامیں کو کہاں بند کروں　　گونجیں گے وہ کاریں گے جہاں بند کروں
خلاق مضامیں تو سبھی ہیں لیکن　　کھل جائے حقیقت جو زباں بند کروں

انیس نے کہا ؎

گلہائے مضامیں کو کہاں بند کروں　　خوشبو نہیں چھپنے کی جہاں بند کروں
میں باعثِ نغمہ سنجی بلبل ہوں　　کھولے نہ کبھی منھ جو زباں بند کروں

چوتھی صورت یہ ہے کہ یکساں قافیوں کو دوسری طرح باندھا۔ مثلاً:

دبیر نے کہا ؎

شیریں سخنی کے فن میں شہ زور ہوں میں　　پر بخت یہ کہتا ہے ارے شور ہوں میں
اس ہند میں طوطیِ قفس کے مانند　　خوبی سے زباں کی زندہ درگور ہوں میں

انیس نے کہا ؎

کس جسم پہ بل کروں کہ شہ زور ہوں میں　　دیکھو کہ ضعیف صورتِ مور ہوں میں
تن پہ یہ پڑی ہے گردِ بازارِ کساد　　ثابت ہوتا ہے زندہ درگور ہوں میں

دبیر نے کہا ہے

اک دن پیوند خاک ہونا ہوگا　　تنہا تنہا لحد میں سونا ہوگا
اس قبر کے پردے کا کھلا حال دبیر　　جو اوڑھنا ہوگا وہ بچھونا ہوگا

انیس نے کہا ہے

آغوش لحد میں جب کہ سونا ہوگا　　جز خاک نہ تکیہ نہ بچھونا ہوگا
تنہائی میں آہ کون ہووے گا انیس　　ہم ہوئیں گے اور قبر کا کونا ہوگا

پانچویں صورت یہ ہے کہ مضمون کو الٹ دیا۔ مثلاً:

انیس نے کہا ہے

رتبہ جسے دنیا میں خدا دیتا ہے　　وہ دل میں فروتنی کو جا دیتا ہے
کرتے ہیں تہی مغز ثنا آپ اپنی　　جو ظرف کہ خالی ہے صدا دیتا ہے

دبیر نے کہا ہے

گنجینۂ جسے رب علا دیتا ہے　　وہ داد عطیۂ خدا دیتا ہے
خاموش حبابوں کے ہیں ظرف خالی　　دریا میں ہیں موتی وہ صدا دیتا ہے

انیس نے کہا ہے

افسوس زمانے کا عجب طور ہوا　　کیوں چرخ کہن، نیا یہ کیا دور ہوا
گردش کب تک نکل چلو جلد انیس　　اب یاں کی زمیں اور، فلک اور ہوا

دبیر نے کہا ہے

کس عہد میں تبدیل نہیں دور ہوا　　گر عدل، کبھی ظلم، کبھی جور ہوا
اللہ وہی ہے تو نہ مضطر ہو دبیر　　کیا غم جو زمیں اور، فلک اور ہوا

جوابی کلام کی مختلف صورتوں کی مثال میں دونوں استادوں کی رباعیاں پیش کر دی گئی ہیں۔ مرثیوں کے بہت سے مقامات بلکہ پورے پورے مرثیے ایک دوسرے کے جواب میں کہے گئے ہیں۔ ان کو مثال میں پیش کرنا بہت وقت چاہتا ہے۔ اس لیے 'مشتے نمونہ از خروارے' کے طور پر دونوں کے مرثیے سے صرف تین تین بیتیں پیش کرنے پر اکتفا کروں گا۔

یہ بات کہ انصاف بڑی کم یاب چیز ہے، دونوں نے یوں کہی ہے:

دبیرؔ ؎

انصاف کہاں سے ہو کہ دل صاف نہیں ہے ۔۔۔ دل صاف کہاں سے ہو کہ انصاف نہیں ہے

انیسؔ ؎

عالم ہے مکدر کوئی دل صاف نہیں ہے ۔۔۔ دنیا میں ہے سب کچھ مگر انصاف نہیں ہے

صبح کے وقت طلوعِ آفتاب کا منظر یوں دکھایا ہے :

دبیرؔ ؎

محتاج ماہتاب ہوا آب و تاب کا ۔۔۔ باغِ جہاں میں پھول کھلا آفتاب کا

انیسؔ ؎

تھا چرخِ اخضری پہ یہ رنگ آفتاب کا ۔۔۔ کھلتا ہے جیسے پھول چمن میں گلاب کا

آخری وقت امام حسینؑ بارگاہ الٰہی میں مناجات کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں ایک ہی مضمون کو دونوں نے یوں ادا کیا ہے :

دبیرؔ ؎

پیش کش لاشۂ اصغر ہی بھلا لائے حسینؑ ۔۔۔ ہاتھ خالی ترے دربار میں کیا آئے حسینؑ

انیسؔ ؎

کوئی ہدیہ ترے لائق نہیں پاتا ہے حسینؑ ۔۔۔ ہاتھ خالی ترے دربار میں آتا ہے حسینؑ

ایک مرتبہ انیسؔ نے ایک سلام کہا جس کا مطلع یہ ہے ؎

سدا ہے فکرِ ترقی بلند بینوں کو ۔۔۔ ہم آسمان سے لائے ہیں ان زمینوں کو

اس کے جواب میں دبیرؔ کے فرزند اوجؔ نے اسی زمین میں ایک سلام کہا ہے جس کا مطلع یہ ہے ؎

یہ زور مدحِ علیؑ کا ہے خوش یقینوں کو ۔۔۔ زمیں سے لے گئے گردوں پہ ان زمینوں کو

مونسؔ نے بھی اس زمین میں ایک سلام کہا اور اس میں زمینوں کے قافیے میں یہ شعر کہا ؎

بھلا تردد بے جا سے ان میں کیا حاصل ۔۔۔ اٹھا چکے ہیں زمیندار جن زمینوں کو

دبیرؔ کی طرف سے جواب میں کہا گیا ؎

قبولِ شرع میں دعوائے بے دلیل نہیں ۔۔۔ دکھائیں گھر کے قبالے میں ان زمینوں کو

ہمارے ابر قلم سے ہے بر محل بارش　　کہ مینھ سے نفع ہے بوئی ہوئی زمینوں کو

دبیر کے شاگرد مشیر نے اس کا جواب یوں دیا ؎

اساتذہ کی ہیں نظمیں سلام بھی اکثر　　نیا سمجھتے ہیں پھر لوگ ان زمینوں کو

انیس کے سلام میں یہ شعر بھی تھا ؎

لگا رہا ہوں مضامین نو کے پھر انبار　　خبر کرو مرے خرمن کے خوشہ چینوں کو

اس کے جواب میں اوج نے کہا ؎

ہزاروں خوشے ہیں مضموں کے ایک دانے میں
غنی کیا مرے خرمن نے خوشہ چینوں کو

انیس کے سلام کا یہ شعر بہت پسند کیا گیا ؎

یہ جھریاں نہیں ہاتھوں پہ ضعف پیری نے　　چنا ہے جامۂ اصلی کی آستینوں کو

اوج نے اس قافیے میں ۲۶ شعر کہے جن میں ایسے شعر بھی ہیں ؎

الٹ گیا در خیبر سے پہلے قلعۂ چرخ　　خدا کے ہاتھ نے الٹا جو آستینوں کو
نماز اہل یقیں کی جہاد اکبر ہے　　وضو کے وقت چڑھاتے ہیں آستینوں کو

اور ایسے شعر بھی ہیں ؎

دکھایا شہ نے جو اعدا کو فن تیر زنی　　بنایا ترکش پر تیر آستینوں کو
برہنہ پا تھے جو عابد تو کہتے تھے باقر　　بناؤ موزہ پا میری آستینوں کو

مونس نے آستینوں کے قافیے میں یہ شعر بھی کہا تھا ؎

مزہ یہ ہے کہ مضامیں بھی دستیاب نہیں　　مقابلے پہ چڑھاتے ہیں آستینوں کو

اوج نے اس کے جواب میں یہ شعر کہے ؎

مقابلے پہ ہوں آمادہ یہ بہ خیر مگر　　ہوئے جو تنگ الٹتے ہیں آستینوں کو
مقابلے پہ جو الٹا کیے سدا مضموں　　جواب میں وہ الٹتے ہیں آستینوں کو

دبیر کے شاگرد مشیر نے اسی زمین میں ایک ہجویہ نظم کہی جس کے دو شعر کسی کو سنانے کے قابل نہیں ہیں اور ایک شعر یہ ہے ؎

ہزار بار سراپا کے منھ پہ چڑھتے ہیں　　مشیر کیا کہوں ان احمق الذینوں کو

اس نظم کا حال سن کر استاد نے شاگرد کو تنبیہ کی اور میر انیس کے پاس بھیج کر ان

سے قصور معاف کر دیا یا پھر خود معاف کیا۔ اگر ایسا نہ کرتے تو ہجوگوئی اور فحاشی کی کیچڑ ایسی اچھلتی کہ لوگ مصحفی اور انشا کے معرکوں اور جرأت و منتظر کی زبان درازیوں کو بھول جاتے۔

انیس و دبیر خود بھی ایک دوسرے پر چوٹیں کرتے اور سرقے کا الزام لگاتے رہتے تھے۔ مثلاً: دبیر نے کہا ؎

سرقہ مضموں کا زبوں ہوتا ہے — یعنی علم نظم نگوں ہوتا ہے
پر ان میں جو مندرج ہو حال شہدا — اس سے مرے مرثیے کا خون ہوتا ہے

انیس نے کہا ؎

بہتا ہے انیس خونِ انصاف — مضموں مرے قتل ہو رہے ہیں

دبیر نے کہا ؎

کہنے میں ہے تاثیر خداداد ہمیشہ — بھولے سے بتا دوں تو رہے یاد ہمیشہ

انیس نے کہا ؎

ہے سہل ممتنع یہ کلام ادق مرا — برسوں پڑھیں تو یاد نہ ہوئے سبق مرا

مضامین کی چوری کا الزام دبیر نے یوں لگایا ؎

سرقہ ہے کہ تالیف ہو مضمونِ کہن کی — یہ سب ہے زکوٰۃ اپنے زر نقد سخن کی

گو دزد سخن سرقہ کرے میرے بیاں سے — ملک سخن تازہ میں یوں تیغ زباں سے

دزدانِ مضامیں پہ نہ کر منع کی تاکید — تو مجتہد نظم ہے فرض ان پہ ہے تقلید

انیس نے یہی الزام یوں لگایا ؎

کب دزد سے دولتِ ہنر بچتی ہے — لے بھاگتے ہیں جیب کہ نظر بچتی ہے
ممکن نہیں دزدانِ مضامیں سے نجات — سچ ہے کہ مگس سے کب شکر بچتی ہے

کس دن مضمونِ نو کا نقشا اترا — پر دزد مضامیں کا نہ چہرا اترا
منبر سے ہم اترے نئے مضموں پڑھ کر — ان کے لیے گویا من و سلویٰ اترا

دبیر نے کہا ؎

ہیں وقفِ ہمیشہ مرے الفاظ و معانی ۔۔۔ ہاں قلزم شیریں کا سبھی پیتے ہیں پانی

انیس نے کہا ؎

نہریں رواں ہیں فیض خمِ مشرقین کی ۔۔۔ پیاسو پیو سبیل ہے نذرِ حسین کی

دبیر نے شاعرانہ تعلّی یوں کی ؎

ہر باغ ہے گلچیں مرے مضموں کے چمن کا ۔۔۔ ہر بحر ہے قطرہ مرے دریائے سخن کا

انیس نے کہا ؎

سبک ہو چلی تھی ترازوئے شعر ۔۔۔ مگر ہم نے پلّہ گراں کر دیا
مری قدر کر اے زمینِ سخن ۔۔۔ تجھے بات میں آسماں کر دیا
نوا سنجیوں نے تری اے انیس ۔۔۔ ہر اک زاغ کو خوش بیاں کر دیا

غرض ایک طرف یہ دونوں استاد ایک دوسرے کا جواب اور جواب الجواب کہتے رہتے تھے، دوسری طرف ان کے ماننے والے گروہ اپنے پسندیدہ استاد کے محاسن اور دوسرے کے نقائص ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر پیش کرتے تھے، اعتراض کیے جاتے تھے اور ان کے جواب دیے جاتے تھے۔ یہ دن رات کے ادبی معرکے عوام کی معلومات میں اضافہ اور ان کی شعری صلاحیت اور تنقیدی شعور کو بیدار کرتے رہتے تھے۔ لکھنؤ کی عام ادبی سطح اتنی بلند کبھی نہ تھی جتنی انیس و دبیر کے عہد میں ہوئی۔

مرزا دبیر کی رُباعی اور میر انیس کا شعر

کئی برس کی بات ہے کہ میرے ایک بزرگ جو انیس مرحوم سے ذاتی واقفیت رکھتے ہیں، میرے استفسار پر اس شاعرِ اعظم کے حالات بیان کر رہے تھے۔ سلسلۂ گفتگو میں انھوں نے یہ فرمایا کہ میر انیس اور مرزا دبیر ایک دوسرے کا جواب کہا کرتے تھے۔ مثال کے طور پر انھوں نے مرزا صاحب کی یہ رباعی پڑھی ؂

نا داں کہوں دل کو کہ خرد مند کہوں
یا سلسلۂ وضع کا پابند کہوں
اک روز خدا کو منھ دکھانا ہے دبیرؔ
بندوں کو میں کس منھ سے خداوند کہوں

اور کہا کہ مرزا صاحب نے جس مضمون کو چار مصرعوں میں ادا کیا ہے اس کو میر صاحب نے کس حسن سے دو مصرعوں میں ادا کر دیا ہے ؂

دل کو ناداں کہوں یا وضع کا پابند کہوں
مجھ سے ہوتا نہیں بندوں کو خداوند کہوں

یہ بزرگ میری والدۂ مرحومہ کے حقیقی ماموں مولوی عبد العلی صاحب، لکھنؤ کے محلے مفتی گنج کے رہنے والے ہیں۔ مگر مدت دراز سے اناؤ میں مقیم ہیں۔ ان کی پیدائش ۱۸۴۳ء (۱۲۵۹ھ) ہے۔ لہٰذا شمسی سال کے حساب سے ان کی عمر اب ۹۲ برس کی اور قمری سال کے حساب سے ۹۶ برس کی ہے[1]۔ ان کے والد میر سلامت علی مرحوم مرثیہ خوانی میں میر انیس کے شاگردِ رشید تھے۔ میر صاحب کے شاگردوں میں آغا میر کے سوا ان سے بہتر مرثیہ پڑھنے والا کوئی اور نہ تھا۔ میر انیس ان کو بہت عزیز رکھتے تھے اور اکثر

---

[1] اس تحریر کے کچھ اوپر ایک سال بعد ۳۰ دسمبر ۱۹۳۴ء کو ان کا انتقال ہو گیا۔

اپنی پیش خوانی میں پڑھواتے تھے۔ ان کے پاس باہر سے فرمائشیں آتی رہتی تھیں کہ اپنے کسی شاگرد کو مرثیہ خوانی کے لیے بھیج دیجیے تو وہ میر سلامت علی کو بھی اپنا شاگرد رشید کہہ کر بھیجتے تھے۔

میر سلامت علی کو مرثیے جمع کرنے کا بڑا شوق تھا۔ گھر میں کھانے کی تنگی ہو تو بھی وہ مرثیہ ضرور خرید لیتے تھے اور معاوضہ دے دے کر نقل کرنے کے لیے مرثیے حاصل کرتے رہتے تھے۔ ان کے جمع کیے ہوئے کثیر التعداد مراثی میں سے دو ڈھائی سو مرثیوں کی زیارت راقم حروف نے بھی اپنے لڑکپن میں کی تھی۔ اکثر مرثیوں پر میر سلامت علی کے دستخط اور مہر ثبت اور تحریر کی تاریخ درج تھی۔ ان میں سے بھی بہت مرثیے اب تلف ہو چکے ہیں۔ جو باقی رہ گئے ہیں وہ مولوی عبدالعلی صاحب کے پاس موجود ہیں۔

میر انیس کا تو تقریباً کل کلام انھوں نے فراہم کر لیا تھا۔ میر سلامت علی کے بارے میں احسن لکھنوی لکھتے ہیں :

"میر سلامت علی صاحب لکھنؤ میں ایک بزرگ تھے جن کو میر انیس مرحوم کا کلیات جمع کرنے کا شوق تھا اور انھوں نے اپنی تلاش سے میر انیس کا اکثر کلام بہم پہنچایا تھا جو خود میر انیس کے پاس نہ تھا۔"[1]

---

[1] واقعات انیس ص۹۳

میر انیسؔ کے ایک مرثیے کا

تنقیدی اور توضیحی تجزیہ

میر انیسؔ کے اس معرکہ آرا مرثیے کو جس کا مطلع یہ ہے ؎

جب قطع کی مسافت شب آفتاب نے

راقم الحروف نے مبسوط مقدمے اور کثیر التعداد توضیحی اور تنقیدی حاشیوں کے ساتھ شاہکار انیسؔ کے نام سے مرتب کیا اور نظامی پریس لکھنؤ نے ۱۹۴۳ء میں اس کا نہایت نفیس، باتصویر، بیش قیمت اڈیشن شائع کیا[1] جیسا کسی مرثیے کا نہ اس سے پہلے کبھی شائع ہوا اور نہ اس کے بعد۔

اس مرثیے کے بارے میں یہ دعوا تو نہیں کیا جاسکتا کہ وہ ہر حیثیت سے اور تمام مرثیوں سے بہتر ہے، مگر اس میں کچھ ایسی خصوصیتیں ضرور ہیں کہ اگر کوئی شخص انیسؔ کا صرف ایک ہی مرثیہ پڑھنا چاہتا ہے تو اس کو اسی مرثیے کا مطالعہ کرنا چاہیے۔ اس مرثیے میں پورا معرکۂ کربلا مختصراً پیش کر دیا گیا ہے۔ اس میں انیسؔ کے ہر طرح کے کلام کے نمونے موجود ہیں اور انیسؔ کی شاعری کے بیشتر محاسن جمع ہیں۔ مرثیے کا جو ڈھانچا انیسؔ کے وقت میں بن چکا تھا اس کے تقریباً تمام اجزا اس مرثیے میں پائے جاتے ہیں۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ جن لوگوں کو مرثیے کے متعلقات پر کافی اطلاع نہیں ہے، جنھوں نے مختلف مرثیہ گویوں کا کلام نہیں دیکھا ہے اور خود انیسؔ کے مرثیوں کا گہرا مطالعہ کر کے وہ زاویۂ نگاہ اور وہ اندازِ فکر پیدا نہیں کر لیا ہے جو کلام انیسؔ کے محاسن کو بہ خوبی سمجھنے کے لیے ضروری ہے، وہ بھی اس مرثیے سے لطف اٹھا سکتے ہیں اور انیسؔ کی شاعری کے بلند مرتبے

---

[1] مقدمہ شاہکار انیسؔ۔ مطبوعہ نظامی پریس، لکھنؤ ۱۹۴۳ء۔

کا کسی قدر اندازہ کر سکتے ہیں۔

اس مرثیے کی تفصیلی تنقید کے لیے تو ایک ضخیم دفتر بھی ناکافی ہے اس لیے اس کا تنقیدی تجزیہ پیش کیا جاتا ہے۔ یعنی اس کے مضامین کا خلاصہ اور اس کے ضمن میں جہاں کسی بات کی طرف توجہ دلانا ضروری معلوم ہوا وہاں اس کا ذکر کولن اور ڈیش کے بعد نئے پیرے میں کر دیا گیا ہے۔

ا۔ پچھلی رات ہے۔ امام حسین اپنے رفیقوں کو نماز کے لیے اٹھاتے ہیں۔ شہادت کے شوق میں خود مسرور ہیں اور اپنے انصار کو بھی نویدِ شہادت سے مسرور کرتے ہیں۔ وہ بستر سے اٹھتے ہیں، کنگھی کرتے ہیں، اچھے اچھے کپڑے پہنتے ہیں، طرح طرح کے عطر لگاتے ہیں۔ یہاں شاعر انصارِ حسین کے انسانی محاسن اور اخلاقی صفات بیان کرتا ہے:۔

اس بیان سے سامعین کے دل میں ان سے محبت اور ہمدردی پیدا ہو جاتی ہے۔

۲۔ امام حسین کے عزیز اٹھارہ بنی ہاشم خیمے سے باہر نکلتے ہیں۔ اب صبح ہو رہی ہے:۔

شاعر یہاں صبح کا منظر دکھاتا ہے۔ اس طرح کی منظر کشی انیس سے پہلے اردو زبان کے کسی شاعر کے یہاں نہیں ملتی۔ انیس نے مختلف وقتوں کے منظر اپنے مرثیوں میں پیش کیے ہیں۔ صبح کا سماں کئی جگہ دکھایا ہے، مگر اس مرثیے میں صبح کے وقت کی جو تصویر کھینچی ہے وہ مجموعی حیثیت سے سب سے زیادہ تفصیلی اور سب سے زیادہ دل کش ہے۔ اس موقعے پر ایسی روح پرور اور مسرت آگیں صبح دکھانے کا ایک خاص سبب ہے۔ دن کے مختلف حصے دل میں مختلف طرح کے تاثرات پیدا کرنے کی فطری صلاحیت رکھتے ہیں۔ لیکن ان تاثرات کی نوعیت انسان کی قلبی کیفیت کی مناسبت سے بدلتی رہتی ہے۔ اگر دل خوش ہے تو کسی دل کش منظر کی دل کشی اور بڑھ جاتی ہے اور اگر دل رنجیدہ ہے تو دل کشی کم ہو جاتی ہے یا بالکل باقی ہی نہیں رہتی۔ انیس نے وقتوں کے منظر کھینچنے میں اس نفسیاتی نکتے پر نظر رکھی ہے۔ یہی سبب ہے کہ مثلاً صبح کے وقت طلوع ہوتے ہوئے آفتاب کا سماں ایک جگہ یوں دکھاتے ہیں:

تھا چرخِ اخضری پہ یہ رنگ آفتاب کا
کھلتا ہے جیسے پھول چمن میں گلاب کا

دوسری جگہ اسی منظر کو یوں پیش کرتے ہیں ؎

تھا بس کہ روز قتل شہ آسماں جناب
نکلا تھا خوں ملے ہوئے چہرے پہ آفتاب

پیش نظر مرثیے میں صبح کا منظر جو اتنا دل کش دکھایا گیا ہے اس کا سبب یہ ہے کہ یہ ان لوگوں کی صبح ہے جن کے لیے "گزری شب فراق دن آیا وصال کا" اور جنھوں نے "راتیں تڑپ کے کاٹی ہیں اس دن کے واسطے"۔ یہ وہ صبح ہے کہ خوشی کے مارے امام حسین کی حالت اس مصرعے کی مصداق ہے کہ "چہرہ خوشی سے سُرخ ہے زہرا کے لال کا" اور انصار حسین کا یہ عالم ہے کہ "لب پر ہنسی، گلوں سے زیادہ شگفتہ رو"۔ اب صبح کے اس منظر کو اس نفسیاتی نقطۂ نظر سے دیکھیے اور انیس کے کمال کی داد دیجیے۔

۳۔ اس موقع پر کچھ آل رسول کی مدح اور کچھ خیمۂ حسین کی تعریف ہے۔ اب نماز صبح کا وقت آگیا ہے۔ حضرت علی اکبر اذان دیتے ہیں۔ یہاں شاعر اس اذان کا اثر انسان وحیوان، شجر و حجر پر دکھاتا ہے۔ خیمے میں اذان کی آواز جاتی ہے۔ سب بی بیاں اپنے اپنے طور پر متاثر ہوتی ہیں۔ اب اقامت ہوتی ہے، نمازی صفیں باندھ کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ شاعر نماز کی صفوں، نمازیوں اور ان کی نماز کی تعریف کرتا ہے:-

اذان اور نماز کا ایسا دل کش مرقع اور کہیں نہیں ملتا۔ بعض شاعروں نے یہ تصویر پیش کرنے کی کوشش کی ہے، مگر ان کے یہاں انیس کی تقلید کے آثار صاف نظر آتے ہیں۔ انیس کے بعد اذان صبح کے بیان میں شاید میر انس کو سب سے زیادہ کامیابی ہوئی۔ ان کی شاعرانہ صناعی کا کمال ملاحظہ ہو ؎

جب لشکر خدا میں سحر کی اذاں ہوئی　　حاضر جماعت شہ کون و مکاں ہوئی
صوت حسن بلند تہہ آسماں ہوئی　　پڑھ کر درود فوج ملک مدح خواں ہوئی
گلہائے بوستان ہمہ تن گوش ہو گئے
طائر جو چہچہاتے تھے خاموش ہو گئے

در آسماں کے کھل گئے اک بار تھے جو بند　　قدسی ہوئے سماع سماعت سے بہرہ مند
سکان قاف سننے لگے صوت دل پسند　　عنقائے مغربی کی بھی گردن ہوئی بلند

مسکن سے باہر آ گئے ساکن پہاڑ کے
اٹھا غرورِ عرش بھی پر جھاڑ جھاڑ کے

اللہ اکبر، اکبرِ غازی کی وہ صدا   تھا جس میں لحنِ حضرتِ داؤد کا مزا
غنچے چمن میں گوشِ سماعت کیے تھے وا   نغمے تھے محو، گنگ تھے مرغانِ خوش نوا
رستوں پہ رہ روؤں کے قدم تھے جمے ہوئے
تھے دم بخود نسیم کے جھونکے تھمے ہوئے

وہ شان اس اذاں کی، مؤذن کا وہ شکوہ   دم بھر رہے تھے عشق کا مردانِ حق پژوہ
جنگل تمام گونجتا تھا، ہل رہے تھے کوہ   تھا محو اپنی اپنی جگہ پر ہر اک گروہ
شیرانِ دشتِ ماریہ خاموش سنتے تھے
حیرت سے کان اٹھائے سیہ گوش سنتے تھے

تھے عالمِ سکوت میں سکانِ بحر و بر   پانی سے مچھلیاں ابھر آئی تھیں سر بسر
ہر اک صدف بھی کان لگائے ہوئے ادھر   تصویر بن گئے تھے درختوں پہ جانور
سکتے میں تھے حجر بھی، شجر بھی، جبال بھی
سبزے سے منہ اٹھائے ہوئے تھے غزال بھی

وہ حزن، وہ زباں کی فصاحت، وہ سوز و ساز   فولاد و سنگ جس سے ہوئے جاتے تھے گداز
طاری ہر ایک نوع پہ تھا خوفِ بے نیاز   سر دھن رہے تھے عشق میں شمشاد سرفراز
زائل تھی بوئے ناز گلوں کے دماغ سے
جاری تھے اشک دیدۂ طاؤسِ باغ سے

تکبیر کی صدا جو پہنچتی تھی دور دور   ساکت کھڑے تھے گلشنِ فردوس کے طیور
آواز روشن ایسی کہ چھایا ہوا تھا نور   راغب تھی سوئے حسنِ فصاحت ہر ایک حور
سرمستِ اشتیاق تھے، جو اہلِ ہوش تھے
دوزخ بھی تھا یہ محو کہ شعلے خموش تھے

وہ شدّ و مد وہ بانگ خوش آیند دل پسند   بلبل کے زمزموں سے جو دل کش ہزار چند
روح القدس کی روح تھی محظوظ و بہرہ مند   صوتِ بلند پھینکتی تھی عرش پر کمند
شوقِ صدائے آلِ رسالت مآب سے   رحمت بھی جوش میں نکل آئی حجاب سے

اس بیان کی دلکشی میں کس کو کلام ہو سکتا ہے؟ مگر ان آٹھ بندوں کا انیس کے آٹھ مصرعوں سے مقابلہ کر کے دیکھیے کہ ان میں انیس کے دو تین مصرعوں کی توضیح و توسیع کے سوا اور کیا ہے۔ انیس کا بیان جن فطری کیفیتوں اور نفسیاتی حقیقتوں پر مبنی ہے، ان کا نشان تک ان بندوں میں نہیں ہے۔

۴۔ نماز ختم ہوتی ہے۔ انصار امام حسین سے مصافحہ کرتے ہیں اور شہادت کی خوشی میں ایک دوسرے کے گلے ملتے ہیں۔ اس کے بعد کوئی شکر کا سجدہ ادا کرتا ہے، کوئی قرآن کی تلاوت کرتا ہے، کوئی دعا پڑھتا ہے، کوئی خدا کی حمد میں مصروف ہے، کوئی رسول کی نعت میں اور امام حسین سب کے لیے خدا سے رحم کی التجا کرتے ہیں۔

ادھر امام حسین اور ان کے انصار عبادت میں مصروف ہیں، اُدھر یزیدی لشکر جنگ کے لیے صف کشی کر رہا ہے۔ لشکر کا سپہ سالار ابن سعد دریائے فرات کے پہرہ داروں کو تاکید کر رہا ہے کہ مرتے دم بھی حسین کو پانی نہ دینا:۔

اس طرح انیس نے دونوں جماعتوں کی سیرت کا فرق دکھایا ہے۔

۵۔ ابھی امام حسین جانماز پر تشریف فرما ہیں کہ لشکر مخالف سے چند تیر آکر گرتے ہیں۔ امام اپنے صاحب زادے حضرت علی اکبر سے کہتے ہیں کہ تم جا کر بی بیوں سے کہہ دو کہ بچوں کو لے کر صحن سے ہٹ جائیں۔ اتنے میں خاندان رسالت کی کنیز فضہ آکر خبر دیتی ہیں کہ خیمے کے اندر بھی تیر آرہے ہیں۔ امام اٹھتے ہیں اور انصار کو جہاد کے لیے تیار ہو جانے کا حکم دے کر خیمے میں تشریف لے جاتے ہیں۔ حضرت عباس خیمے کے دروازے پر ٹہلنے لگتے ہیں۔ تیروں کا آنا جنگ کا پیام تھا، اس لیے بی بیوں میں بہت اضطراب پیدا ہو جاتا ہے۔ حضرت زینب دعائیں مانگنے لگتی ہیں۔ امام حسین سب کو تسکین دیتے ہیں اور رسول کے تبرکات طلب فرماتے ہیں۔ رسول کا لباس پہنتے ہیں اور حضرت علی اور حضرت حمزہ کے ہتھیار لگاتے ہیں:۔

رسول کا لباس اس لیے پہنتے ہیں کہ امر رسالت کی تکمیل کے لیے جا رہے ہیں اور یزیدیوں کو یاد دلانا چاہتے ہیں کہ ہم تمھارے رسول کے فرزند ہیں، ہماری مودت تم پر فرض ہے اور ہم سے تمسک کرنا ہی تم کو گمراہی سے محفوظ رکھ سکتا ہے۔ حضرت حمزہ اور حضرت علی کے ہتھیار اس لیے لگاتے ہیں کہ عہد رسالت میں وہ اسلام کے

سب سے بڑے مجاہد تھے اور آج امام حسین کو اسلام کے لیے سب سے بڑا جہاد کرنا ہے۔
۶۔ اب رسول کے لشکر کا علم سجایا جاتا ہے۔ حضرت زینب کے صاحب زادے عون و محمد علم کے پاس آکر کھڑے ہوجاتے ہیں۔ ان کے دادا حضرت جعفر اور نانا حضرت علی دونوں لشکر رسول کے علم دار رہ چکے تھے۔ اس بنا پر وہ خود کو وراثتاً اس علم کا مستحق سمجھتے ہیں اور اپنی مادر گرامی سے اپنی سفارش کی درخواست کرتے ہیں۔ وہ اس بات پر ناراض ہوتی ہیں اور فرماتی ہیں کہ "آج تو مرنے میں نام ہے۔" امام حسین یہ گفتگو سن کر حضرت زینب کے پاس آتے ہیں اور عون و محمد کی تعریف کر کے اپنی بہن سے فرماتے ہیں، "اب تم جسے کہو اسے دیں فوج کا علم۔" وہ حضرت عباس کی خوبیاں بیان کر کے ان کو علم داری کے لیے سب سے بہتر قرار دیتی ہیں۔ امام حسین حضرتِ عباس کو بلا کر علم دیتے ہیں اور کہتے ہیں "لو بھائی لو علم، یہ عنایت بہن کی ہے" یہاں شاعر علم داری کا منصب ملنے پر حضرت عباس، حضرت زینب، زوجۂ عباس اور حضرتِ سکینہ کے دلی تاثرات دکھاتا ہے:۔
میر انیس نے یہ علم کا قضیہ، تفصیلات و جزئیات کو بدل بدل کر کئی جگہ لکھا ہے، مگر یہاں اس کو سب سے زیادہ تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے اور اس بیان میں وہ وہ نفسیاتی نکتے ملحوظ رکھے ہیں، اخلاقی تعلیم کے ایسے ایسے گوشے نکالے ہیں اور حسن بیان اور زور کلام کا وہ کمال دکھایا ہے کہ اس مرثیے کا یہ مقام بے مثل ہو گیا ہے۔ انیس کی بہ دولت علم کا قضیہ مرثیے کا ایک اہم موضوع بن گیا ہے، جس پر دوسرے مرثیہ گویوں نے خوب خوب زور طبع صرف کیا، مگر کوئی نقل اصل کو نہ پہنچ سکی۔
۷۔ اتنے میں حضرت قاسم آکر خبر دیتے ہیں کہ دشمنوں کی کثیر فوج بڑھتی چلی آتی ہے۔ یہ سن کر حضرت عباس علم لیے ہوئے خیمے سے نکلتے ہیں اور امام حسین اپنے تمام عزیزوں کے ساتھ اہل حرم سے رخصت ہوتے ہیں:۔
انیس کے مرثیوں میں رخصت کا مقام بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ وہ اکثر اس مقام کو ذرا تفصیل سے لکھتے ہیں اور سامعین کے جذبات کو خوب متحرک کرتے ہیں۔ ایک فرد کی رخصت کے سلسلے میں بند پر بند لکھتے چلے جاتے ہیں۔ مثلاً جس مرثیے کا مطلع ہے "کیا غازیانِ فوج خدا نام کر گئے" اس میں حضرت علی اکبر کی رخصت ۶۰ بندوں میں

بیان کی ہے۔ مگر زیر نظر مرثیے میں امام حسین اور ان کے کل عزیزوں کی رخصت صرف ڈیڑھ بند میں لکھ دی ہے۔ انیس کے مرثیوں کی ترکیب پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ مرثیے کا خاکہ بنا لیتے تھے اور اسی کے مطابق ایک ہی بات کو کبھی تفصیل کے ساتھ بیان کرتے تھے کبھی اختصار کے ساتھ۔

۸۔ حضرت عباس خیمے سے برآمد ہوتے ہیں۔ امام حسین کی مختصر فوج ان کو علمداری کی مبارک باد دیتی ہے اور علم کے آگے ہولیتی ہے۔ اب امام حسین حرم سرا سے باہر تشریف لاتے ہیں اور گھوڑے پر سوار ہوتے ہیں۔ اس مقام پر انیس دو بندوں میں گھوڑے کی اور ایک بند میں علم کی تعریف کرتے ہیں:۔

فارسی قصیدوں میں ممدوح کے گھوڑے کی تعریف کرنے کا رواج تھا۔ اردو قصیدوں میں بھی اس رواج کی پیروی کی گئی ہے۔ مگر قصیدہ گو گھوڑے کی تعریف میں خلاف قیاس مبالغے سے کام لیتے تھے۔ انیس نے اس تعریف میں وہ انداز اختیار کیا جس سے ایک اصل نسل کے درست عربی گھوڑے کی خوب صورت تصویر آنکھوں کے سامنے پھر جاتی ہے۔ اس موقع پر گھوڑے کی حقیقی خوبیاں اس حسن اور اختصار کے ساتھ بیان کی گئی ہیں کہ اس کی مثال ملنا مشکل ہے۔

۹۔ حسینی فوج کربلا میں پہنچ گئی۔ یہاں شاعر چار بندوں میں ہاشمی جوانوں اور بچوں کے شان دار حسن کی تعریف کچھ اپنی زبان سے اور کچھ حوروں کی زبان سے کرتا ہے۔ یہ چار بند سراپا کے قائم مقام ہیں۔ انیس سے پہلے میر ضمیر نے سراپا یعنی ممدوح کے قد و قامت اور خال و خط کا بیان مرثیوں میں داخل کر دیا تھا۔ سراپا کا مدعا تو یہ تھا کہ سر سے لے کر پیر تک ایک ایک عضو کا حسن بیان کیا جائے۔ مگر اس بیان میں ایسی ایسی تخیل آرائیاں اور لفظی شعبدہ بازیاں ہونے لگیں جن سے سراپا کا مقصد ہی فوت ہو گیا اور ممدوح کی حسین صورت اور زیبا قامت کا نگاہوں میں پھر جانا کیا کوئی انسانی تصویر بن ہی نہ سکی۔ انیس کی طبیعت لفظوں سے کھیلنا کب پسند کر سکتی تھی۔ انھوں نے ابتدا میں چند مختصر اور نامکمل سراپا لکھے مگر بہت جلد محسوس کر لیا کہ یہ لفظی بازی گری مرثیے کے ممدوحین کی شان کے خلاف ہے اس لیے انھوں نے سراپا لکھنا ترک کر دیا، مگر ممدوح کے حسن ظاہری کا بیان اختصار اور

متانت کے ساتھ کبھی اپنی اور کبھی حوروں کی زبان سے کیا ہے۔ حوروں کی زبان سے ان کے حسن کی تعریف کرنے میں یہ بات نکلتی ہے کہ حوریں جو حسن و جمال کے انتہائی تصورات کے جنتی مجسمے ہیں وہ اگر کسی کے حسن کی تعریف کریں تو اس کا حسن ہے اور ارضی حسن سے بالاتر ہے۔

۱۰۔ اب فوج مخالف کی طرف سے تیر آتے ہیں۔ امام حسین آگے بڑھ کر اتمام حجت کرتے ہیں۔ اس کے بعد جنگ شروع ہو جاتی ہے۔ پہلے رفیق میدان میں آتے ہیں اور داد شجاعت دیتے ہیں۔ اس کے بعد عزیز جہاد کے لیے نکلتے ہیں:۔

اوپر لکھا جا چکا ہے کہ انیس مرثیے کا خاکہ پہلے سے تجویز کر لیتے تھے اور اسی کی مناسبت سے ہر مقام پر طول یا اختصار سے کام لیتے تھے۔ اس مرثیے میں ان کو امام حسین کی جنگ بہت تفصیل سے لکھنا تھی اور آپ ہی کی شہادت سے سامعین کے جذبات غم کو متحرک کرنا تھا۔ اس لیے آپ کے کل انصار اور اعزہ کی جنگ، تیروں کی آمد سے لے کر خاتمۂ فوج تک، صرف نو بندوں میں دکھائی گئی ہے اور فقط ان کی بہادری کا ذکر اس انداز سے کیا ہے کہ غم کا پہلو ابھرنے نہیں پایا۔ رفیقوں اور عزیزوں کی شجاعانہ جنگ کی ایک جھلک دکھا دینے سے شاعر کا مقصد امام حسین کی تنہائی اور بے کسی کی حالت کو اچھی طرح نمایاں کرنا ہے۔

۱۱۔ ظہر کے وقت تک حسینی فوج کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ امام حسین سب شہیدوں کی لاشیں مقتل سے اٹھا لائے تھے، اب انھیں لاشوں کے بیچ میں تنہا کھڑے ہوئے ہیں۔ دشمن فتح کے باجے بجا رہے ہیں اور امام کا دل دکھانے کے لیے شہیدوں کا نام لے لے کر پکار رہے ہیں۔ آپ اپنے خیمے کے دروازے پر تشریف لاتے ہیں اور اپنی بہن زینب سے فرماتے ہیں کہ علی اصغر کو لے آؤ، ایک مرتبہ اس چاند کو اور دیکھ لوں۔ آپ کی آواز سن کر سب بی بیاں دوڑ پڑتی ہیں۔ حضرت شہربانو علی اصغر کو لیے ہوئے آتی ہیں۔ آپ بچے کو زانو پر بٹھا کر پیار کرتے ہیں۔ اسی اثنا میں ایک تیر آ کر بچے کی گردن پر لگتا ہے اور وہ تڑپ کر ختم ہو جاتا ہے:۔

حضرت علی اصغر کی شہادت کے متعلق جو روایت عام طور پر مشہور ہے اسی کو انیس نے بھی اپنے دوسرے مرثیوں میں اختیار کیا ہے۔ اور اس معصوم کی شہادت

کا حال اس طرح بیان کیا ہے کہ پتھر کا دل پانی ہو جائے۔ مگر یہاں اور شاید صرف یہاں اس واقعے کو دوسری طرح پیش کیا ہے اور سامعین کے جذبۂ غم میں صرف خفیف سی تحریک پیدا کی ہے۔

۱۲۔ امام حسین بچے کو خاک کے سپرد کرکے فوج مخالف کا رخ کرتے ہیں۔ شاعر ایک بند میں آپ کی شان دکھاتا ہے اور ایک بند میں آپ کے گھوڑے کی تعریف کرتا ہے:۔

انیس نے اس مقام پر امام حسین کے گھوڑے میں وہ صفات بیان کیے ہیں جو اس موقعے سے خاص مناسبت رکھتے ہیں۔ صبح کے وقت جب امام حسین اپنے عزیزوں اور رفیقوں کے ساتھ میدان شہادت کی طرف تشریف لے جارہے تھے تو ایک مسرت اور شگفتگی کا عالم تھا اور عقیدت اور محبت کی آنکھیں آپ کی سواری کی شان دیکھ رہی تھیں۔ اس حالت میں شاعر نے آپ کے گھوڑے کی تعریف یوں کی تھی۔

سارا چلن خرام میں کبک دری کا ہے
گھونگھٹ نئی دلھن کا ہے چہرہ پری کا ہے

ظہر کے وقت فضا بالکل بدل چکی ہے۔ امام حسین جہاد کے ارادے سے سوار ہو رہے ہیں، چاروں طرف وہ مجمع ہے جو امام کو ایک زبردست حریف اور بہادر سپاہی کی حیثیت سے دیکھ رہا ہے۔ اس موقعے پر شاعر اسی گھوڑے کی تعریف یوں کرتا ہے ؎

رستم تھا درع پوش کہ پاکھر میں راہوار
جرّار، بردبار، سبک رو، وفا شعار

شاعر نے دو مختلف حالتوں کی مناسبت سے ایک ہی گھوڑے کی دو مختلف تصویریں کھینچی ہیں۔ شاعرانہ مصوّری اس کا نام ہے اور انتخاب شاعرانہ اسی کو کہتے ہیں۔

۱۳۔ اب شاعر گرمی کی شدت کا بیان کرتا ہے:۔

یہ بیان کسی قدر ناگہانی طور پر شروع ہو جاتا ہے۔ انیس نے گرمی کی شدت کا بیان اس قدر طولانی اور اتنا مبالغہ آمیز کسی دوسری جگہ نہیں لکھا ہے۔ اس بیان میں جو مبالغہ کیا گیا ہے وہ جا بجا غلو کی حد تک پہنچ گیا ہے۔ مگر باکمال شاعر نے

مبالغے کے ساتھ اصلیت کی آمیزش اس ہوشیاری کے ساتھ کی ہے اور دونوں کو اس طرح دوش بہ دوش لے چلا ہے کہ گرمی کی شدت کا حقیقی احساس قدم قدم پر ہوتا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ حسن بیان، ندرت تشبیہات، جدت استعارات، حسن تعلیل وغیرہ اتنی خوبیاں اس بیان میں بھر دی ہیں کہ سامعین پر ایک حیرت سی طاری ہو جاتی ہے اور ان کو مبالغے اور اصلیت میں امتیاز کرنے کا ہوش نہیں رہتا۔ مبالغہ کلام کی صنعتوں میں شمار کیا گیا ہے اور اس میں شک نہیں کہ یہ مقام اس صنعت کی بے مثل مثال ہے۔ مگر یہ انیس کا خاص رنگ نہیں ہے۔ وہ حقیقی کیفیات کو تخیلی مضامین سے کہیں بہتر سمجھتے تھے اور اصلیت کو مبالغے پر ترجیح دیتے تھے۔ انھوں نے کئی جگہ اپنے خاص رنگ میں بھی گرمی کی شدت کا بیان کیا ہے۔ مثلاً ؎

وہ گرمیوں کے دن وہ پہاڑوں کی راہ سخت — پانی نہ منزلوں نہ کہیں سایۂ درخت

ڈوبے ہوئے پسینے میں ہیں غازیوں کے رخت — سونلا گئے ہیں رنگ جو انسان نیک بخت

راکب عبائیں چاند سے چہروں پہ ڈالے ہیں

توسنے ہوئے سمند زبانیں نکالے ہیں

گرمی کے اس طولانی بیان سے کلام کا سلسلہ ٹوٹ گیا تھا۔ مگر شاعر نے یہ مصرع کہہ کر کس خوب صورتی سے اسے جوڑ دیا ہے ع

اُس دھوپ میں کھڑے تھے اکیلے شہ امم

اس مصرعے نے اس طولانی بیان کو بے محل اور بے ضرورت ہونے کے اعتراض سے بچا لیا۔

۱۴۔ امام حسین اس شدت کی دھوپ میں کھڑے ہوئے ہیں۔ پیاس سے زبان میں کانٹے پڑ گئے ہیں۔ اُدھر لشکر مخالف میں پانی کی ریل پیل ہے۔ جونمرد اور پرند سیراب ہو رہے ہیں۔ زمین پر چھڑکاؤ کیا جا رہا ہے۔ عمر سعد سر پر چتر زر لگائے ہوئے ہے۔ خادم پنکھے جھل رہے ہیں۔ وہ امام حسین سے کہتا ہے کہ اب بھی اگر آپ یزید کی بیعت کر لیں تو آپ کو پانی مل سکتا ہے۔ امام حسین جواب میں فرماتے ہیں کہ اب پانی کی مجھ کو طلب نہیں۔ اگر میں حکم دوں تو خلیل اللہ میرے لیے کھانا لے کر آئیں اور کوثر مجھے پانی پلائے۔ اور اگر میں انقلاب چاہوں تو دنیا ختم ہو جائے، زمین اس

طرح الٹ جائے کہ نہ کوفہ باقی رہے نہ شام۔

یہ بیان امام حسین سے مذہبی عقیدت رکھنے والوں کو اصلیت کے مطابق اور دوسروں کو اصلیت کے خلاف معلوم ہوگا۔ حقیقت یہ ہے کہ اس بیان میں واقعی اصلیت ہو یا نہ ہو، شاعرانہ اصلیت ضرور ہے۔ شاعرانہ اصلیت سے کیا مراد ہے، یہ خواجہ حالی سے سنیئے فرماتے ہیں:

"اصلیت پر مبنی ہونے سے یہ مراد نہیں ہے کہ ہر شعر کا مضمون حقیقت نفس الامر پر مبنی ہونا چاہیئے بلکہ یہ مراد ہے کہ جس بات پر شعر کی بنیاد رکھی گئی ہے وہ نفس الامر میں، یا لوگوں کے عقیدے میں، یا محض شاعر کے عندیے میں فی الواقع موجود ہو، یا ایسا معلوم ہوتا ہو کہ اس کے عندیے میں فی الواقع موجود ہے۔"[1]

اس مقام پر شاعر نے امام حسین کی زبان سے جو کچھ کہا ہے اس پر وہ دل سے اعتقاد رکھتا ہے۔ اس لیے اس کے کلام میں شاعرانہ اصلیت پورے طور پر موجود ہے۔

۱۵۔ ابن سعد سے یہ کہہ کے امام حسین نے غصے میں ذوالفقار کی طرف جو نگاہ کی تو ابن سعد خوف سے پیچھے ہٹ گیا۔ فوج مخالف سے تیر برسنے لگے، سیاہ نشان کھل گئے، فوجی باجے بجنے لگے، نیزہ بردار سواروں نے گھوڑے بڑھائے۔ امام حسین نے رجز پڑھا، تلوار نکالی اور دشمنان دین پر حملہ کر دیا۔ یہاں شاعر تلوار کی تعریف کرتا ہے:۔

تلوار کی تعریف حقیقت میں تلوار چلانے والے کی تعریف ہوتی ہے۔ مگر انیس نے بعض مقامات پر تلوار ہی کی تعریف کی ہے اور بعض موقعوں پر تلوار کا نیام سے نکلنا اور اس کا چلنا تغزل کے رنگ میں بیان کیا ہے۔ یہاں بھی تلوار کی تعریف میں پہلا بند اسی رنگ کا ہے۔ ایسے موقعوں پر تغزل کے ساتھ متانت کو قائم رکھنا اور ابتذال سے بچنا ضروری ہے اور میر انیس ان شرائط کو بہ خوبی ملحوظ رکھتے ہیں۔

۱۶۔ پندرہ بندوں میں تلوار کی تعریف کرنے کے بعد شاعر امام حسین کی جنگ کے

---

[1] شعر و شاعری ص۸۸

بیان میں تیرہ بند اور لکھتا ہے۔ ان اٹھارہ مخمّس بندوں میں تنہا امام حسین کا یزیدی فوج سے مقابلہ کرنا دکھایا گیا ہے۔ بڑی گھمسان کی لڑائی ہو رہی ہے، زمین ہل رہی ہے سر قلم ہو رہے ہیں، صفوں پر صفیں کٹ کٹ کر گر رہی ہیں، ڈھالوں کے پرنچے اڑ رہے ہیں، زرہوں کی کڑیاں بکھری پڑی ہیں، کسی کے حواس ٹھکانے نہیں ہیں، بھاگڑ پڑی ہوئی ہے، "الاَمان" کا شور بلند ہے :-

امام حسین کی جنگ یہاں جس زور شور کی دکھائی گئی ہے وہ شاید بعض لوگوں کو اصلیت کے خلاف معلوم ہو۔ یہ غلط فہمی دور کرنے کے لیے مولانا شبلی کی رائے پیش کی جاتی ہے۔ فرماتے ہیں :-

"شاعری میں اصلیت اور واقعیت کا لحاظ تاریخی حیثیت سے نہیں کیا جاتا۔ بلکہ صرف یہ دیکھا جاتا ہے کہ شاعر کو ان باتوں کا یقین ہے یا نہیں۔ اگر وہ ان باتوں پر یقین رکھتا ہے، ان کے اثر سے لبریز ہے اور جس قدر اس کے دل پر اثر ہے اسی جوش کے ساتھ اس کا اظہار بھی کرتا ہے تو اس کی شاعری بالکل اصلی ہے...... شاعر (انیس) کو قطعی یقین ہے کہ امام حسینؑ تمام عالم کے کاروبار کے مالک ہیں، جن وانس، شجر و حجر سب ان کے محکوم ہیں۔ ان کا غیظ میں آنا پروردگار عالم کا غیظ میں آنا ہے۔ اس صورت میں اگر ان کی حملہ آوری سے زمین و آسمان ہل جائیں اور دنیا متزلزل ہو جائے تو تعجب کی کیا بات ہے[1]"

۱۷۔ امام حسین کی جنگ سے فوج مخالف اس قدر عاجز اور خوف زدہ ہو جاتی ہے کہ سب دہائی دینے لگتے ہیں اور علی اکبر کی روح کا واسطہ دے کر رحم کی التجا کرتے ہیں۔ امام حسین ہاتھ روک لیتے ہیں۔ ابن سعد اپنی فوج کو غیرت دلاتا ہے۔ دو نامی پہلوان مقابلے کے لیے نکلتے ہیں۔ ایک کو اپنی تلوار پر ناز ہے، دوسرے کو اپنے گرز پر۔ دونوں امام حسین کے ہاتھ سے قتل ہوتے ہیں :-

ابھی پورے لشکر سے امام حسین کی جنگ دکھائی جا چکی ہے۔ اب ایک ایک

---

[1] موازنۂ انیس و دبیر

پہلوان سے آپ کی جنگ دکھاتا ہے۔ یزیدی پہلوانوں کی تصویر کھینچنا انیس کے لیے ایک مشکل کام تھا۔ ایک طرف اُن کو امام حسین کی شجاعت اور سپہ گری دکھانا ہے، جس کا تقاضا یہ ہے کہ ان پہلوانوں کو طاقت ور، بہادر، اور آزمودہ سپاہیوں کی حیثیت دی جائے۔ دوسری طرف ان کے مذہبی عقائد کسی طرح اس کی اجازت نہیں دے سکتے کہ امام سے جنگ کرنے والوں کی کسی صورت سے بھی مدح کی جائے۔ انیس نے اس مشکل کو بڑی خوبی سے حل کر لیا ہے اور مدح و ذم کی آمیزش اس طرح کر دی ہے کہ ان کا مقصد بھی حاصل ہو جاتا ہے اور ان پہلوانوں کی طرف سے نفرت بھی پیدا ہو جاتی ہے۔ ان پہلوانوں کی جنگ کو ذرا غور سے پڑھیے تو ایک لطیف نکتہ نکلتا ہے بند ۱۶۵ کا چھٹا مصرع بند ۱۶۲ کے آخری تین مصرعے، بند ۱۶۳ کا پہلا مصرع اور بند ۱۶۴ کے آخری تین مصرعوں پر خاص طور سے نظر کیجیے تو معلوم ہوگا کہ جس پہلوان کو اپنی تیغ زنی پر ناز تھا اس کو امام حسین نے تلوار سے قتل کیا اور جس کو اپنے گرز کی ضربت پر ناز تھا اس کو گرز سے ہلاک کیا۔ اس طرح شاعر نے فنون جنگ میں امام حسین کی کامل مہارت دکھادی ہے۔ ایسے نکتے انیس کے کلام میں جگہ جگہ چھپے ہوئے ہیں۔ ان کو ڈھونڈھ نکالنے کے لیے ایک ایک مرثیے کو انتہائی غور و خوض کے ساتھ کئی کئی دفعہ پڑھنا ضروری ہے۔ انیس نے اس مرثیے میں امام حسین کی جنگ ۴۴ بندوں میں لکھی ہے۔ امام کی جنگ کا اتنا طولانی اور تفصیلی بیان شاید کسی دوسرے مرثیے میں نہ ملے۔

۱۸۔ امام حسین کی جنگ سے ان کی ہیبت ساری دنیا پر چھا جاتی ہے۔ اتنے میں ایک غیبی آواز اس جنگ کی مدح کرتی ہے اور امام حسین کو یہ مژدہ دیتی ہے کہ خدا نے تم کو کائنات پر غالب کیا اور تمھاری ذات پر جہاد کا خاتمہ ہو گیا:۔

یہ ندائے غیب جو صرف امام حسین کے کانوں میں پہنچی کوئی بیرونی آواز نہیں ہے۔ یہ اس مطمئن دل کی آواز ہے جس کو احساس ہے کہ میں نے حق کی حمایت میں وہ جہاد کیا ہے جیسا نہ کبھی کسی نے کیا اور نہ کبھی کوئی کر سکے گا۔ یہ جہاد صرف ایک تن تنہا کا ایک کثیر العداد لشکر سے مقابلہ نہ تھا، بلکہ ان تمام فطری اور انسانی کمزوریوں سے مقابلہ تھا جو حق پر قائم رہنے میں خلل انداز ہوتی ہیں۔ یہ بھوک سے مقابلہ تھا، پیاس سے مقابلہ تھا، عزیزوں اور دوستوں کی محبت سے مقابلہ تھا، مخدرات عصمت کے حفظ ناموس کی خواہش سے مقابلہ

تھا، شدید ترین جسمانی تکلیفوں سے مقابلہ تھا، موت کے خوف سے مقابلہ تھا' یہ ندائے غیب ان تمام زبردست حریفوں سے مقابلے میں کامیاب رہنے والے مجاہد کے مطلئن دل کی آواز ہے' اس کے دل کی آواز ہے جو محسوس کر رہا ہے کہ اس جہاد راہ خدا کے باعث مجھے کائنات پر فتح حاصل ہو گئی ہے' سارے عالم کے دل پر میری حکومت قائم ہو گئی ہے' اب کوئی چیز باقی نہیں ہے جس سے جنگ کرنا ضروری ہو' جہاد کی تمام منزلیں طے ہو چکیں۔ انیسؔ نے اس مصرع "بس خاتمہ جہاد کا ہے تیری ذات پر" میں ایک اور لطیف نکتہ رکھا ہے۔ وہ جس مذہبی عقیدے کے پیرو تھے اس کی رو سے امام حسین کا یہ جہاد آخری اسلامی جہاد تھا۔ اس کے بعد کوئی جہاد نہ ہوا ہے نہ امام عصر کے ظہور تک ہو سکتا ہے۔ وہی ندائے غیب یا دل کی آواز کہتی ہے کہ اب جنگ موقوف کرو' عصر کی نماز کا وقت آ گیا ہے۔ ان دو جملوں میں اشارہ ہے اس بات کی طرف کہ جن اصولوں کی حفاظت کے لیے' جن نیکیوں کے استحکام کے لیے' یہ جہاد کیا ہے ان کی بنیاد خدا کے وجود کے سچے اعتقاد اور اس کی معبودیت اور اپنی عبدیت کے زندہ اور روشن احساس پر قائم ہے۔ اس لیے خدا کی عبادت کو قائم رکھنے ہی سے اس جہاد کا مقصد پورا ہو سکتا ہے۔

۱۹۔ وہی آواز کہتی ہے کہ پیاس کی حالت میں اتنے بڑے انبوہ سے کسی نے ایسی جنگ نہیں کی' اب امت کے کام کی طرف توجہ کرنا چاہیے:۔

آخری جملے میں شہادت کی طرف اشارہ ہے' جس کے بغیر امت کا کام نہیں بن سکتا تھا۔ یزیدی سیرت اور یزیدی حکومت امت اسلامیہ کی تباہی کا باعث تھی۔ اس تباہی سے امت کو بچانے کے لیے امام حسین کی شہادت ضروری تھی۔ اگر ان شدید مصائب اور اس عظیم جنگ کے بعد بھی امام حسین کی جان بچ جاتی تو یزیدی سیرت سے بیزاری پیدا نہ ہوتی' یزیدی حکومت کی بنیاد متزلزل نہ ہوتی اور امت اسلامیہ تباہی سے محفوظ نہ رہتی۔ ندائے غیب کے آخری جملے میں 'اب' کا لفظ بہت معنی خیز ہے۔ اس جملے کو اس سے پہلے والے جملے کے ساتھ پڑھیے اور 'اب' کے معنی پر غور کیجیے تو صاف ظاہر ہوگا کہ اس کے معنی یہ ہیں کہ یہ تمام مصائب برداشت کرنے اور اس پیاس کی حالت میں اتنے بڑے لشکر سے ایسی جنگ کرنے کے بعد اب سر دینے کا

مناسب وقت آیا ہے۔ اگر یہ منزلیں طے کرنے سے پہلے امام حسین اپنی شہادت گوارا کر لیتے تو ان کا مقصد پورا نہ ہوتا اور امّت کا کام نہ بنتا۔

۲۰۔ اس غیبی آواز کو سن کر امام حسین تلوار میان میں رکھ لیتے ہیں۔ دشمنوں کی فوج یہ دیکھ کر پلٹ پڑتی ہے۔ تیروں، تلواروں اور نیزوں کا مینھ برسنے لگتا ہے اور کاری زخم کھا کر امام گھوڑے سے گرتے ہیں۔ حضرت زینب خیمے سے نکل آتی ہیں اور حالتِ اضطراب میں اپنے بھائی کو ڈھونڈتی ہوئی جب قتل گاہ میں پہنچتی ہیں تو امام حسین کے سر کو نیزے کی نوک پر بلند دیکھتی ہیں، اور اس سر سے خطاب کر کے بین کرتی ہیں۔ امام کا سر حضرت زینب کو یزیدیوں کے مظالم پر صبر و شکر کرنے کی تلقین کرتا ہے اور سکینہ کا خاص طور پر خیال رکھنے کی وصیّت کرتا ہے:۔

امام حسین کا زخمی ہو کر شہید ہونا، حضرت زینب کا خیمے سے نکل کر قتل گاہ میں پہنچنا اور بھائی کا سر دیکھ کر بین کرنا، یہ واقعات تفصیل کے ساتھ بیس بندوں میں بیان کیے گئے ہیں۔ یہ مرثیے کا سب سے ضروری حصہ ہے۔ اسی کی بنیاد پر انیس کا مرثیہ مرثیہ کہلاتا ہے ورنہ حقیقت میں وہ ایک خاص طرح کی بیانیہ اور رزمیہ نظم ہے، جس کا میدان مرثیے سے کہیں زیادہ وسیع ہے۔

۲۱۔ اصل مرثیہ ختم کرنے کے بعد انیس نے ایک بند اور لکھا ہے، جس میں بتایا ہے کہ یہ مرثیہ پیری اور ضعیفی کے عالم میں کہا گیا ہے اور پیشین گوئی کی ہے کہ یہ کلام ہر طبقے میں مقبول ہو گا اور یہ مرثیہ دنیا میں یادگار رہے گا۔ بڑھاپے میں شاعر کی طبیعت کی یہ جوانی حیرت انگیز ہے اور اتنی مدت تک اس مرثیے کا مقبول رہنا یقین دلاتا ہے کہ انیس کی پیشین گوئی پوری ہو گی اور جب تک اردو زبان باقی ہے یہ مرثیہ بھی باقی رہے گا اور اپنے مصنّف کا نام روشن رکھے گا۔

انیس کی تضمین

مونس کے سلام پر

میرے کتب خانے میں میر انیس کا غیر مطبوعہ کلام مرثیوں، سلاموں، رباعیوں مخمسوں وغیرہ کی شکل میں اچھی خاصی مقدار میں موجود ہے۔ اڈیٹر صاحب سرفراز کی فرمائش پر اس ذخیرے میں سے ایک مخمس ناظرین سرفراز کے ملاحظے کے لیے پیش کیا جاتا ہے۔ میر مونس کو سلام کہنے میں خاص شہرت حاصل ہے۔ ان کا وہ سلام جس کا مطلع ہے

اے مجرئی گیا سر سرور کہاں کہاں
قرآں لیے پھرے ہے ستم گر کہاں کہاں

اتنی شہرت رکھتا ہے جتنی شاید ہی کسی دوسرے سلام کو نصیب ہوئی ہو۔ میر مونس نے یہ بلند پایہ سلام تصنیف کرنے کے بعد جس مسرت آمیز اطمینان کا اظہار کیا ہے اُس میں وہ بالکل حق بجانب ہیں۔ فرماتے ہیں ؎

مونس ترے سخن کی ہوئی شش جہت میں دھوم
تیغ زباں کے پہنچے ہیں جوہر کہاں کہاں

میر مونس کو اس سلام میں جو کامیابی ہوئی اُس کا ایک ثبوت تو خود سلام کی مقبولیت ہے لیکن اُس کا ایک زبردست ثبوت اور بھی ہے وہ یہ کہ میر انیس نے اس کو مخمس کیا ہے اور اس طرح میر مونس کے شاعرانہ کمال کی داد دی ہے یہ مخمس ابھی تک منظر عام پر نہیں آیا۔
اہل نظر دیکھیں کہ جیسا لاجواب سلام ہے ویسی ہی اُس کی بے مثال تخمیس بھی کی گئی ہے ؎

چمکا خدا کے عرش کا اختر کہاں کہاں — کھایا علیؑ کے چاند نے چکر کہاں کہاں
پہنچا سناں پہ نیر اکبر کہاں کہاں — اے مجرئی گیا سر سرور کہاں کہاں
قرآں لیے پھرے ہیں ستم گر کہاں کہاں

مطبوعہ ہفت وار سرفراز لکھنؤ یکم محرم ۱۳۶۳ھ = ۸ جنوری ۱۹۴۴ء

یثرب میں پوچھتا تھا جو شہ سے بہ چشم تر ‏ ‏ ‏ دل مضطرب ہے اے اسد اللہ کے پسر
کعبے سے جائے گا کہاں قصد ہے کدھر ‏ ‏ ‏ کہتے تھے شاہ ہے یہ سفر آخری سفر

لے جائے دیکھیں ہم کو مقدر کہاں کہاں

بعد پدر اسیری زنداں کے دکھ اٹھائے ‏ ‏ ‏ چھوٹے تو نابلد تھے کہیں بھاگنے نہ پائے
داغ قضا کہ پنجۂ حارث میں دونوں آئے ‏ ‏ ‏ مسلم کے لاڈلوں کو نہ چھوڑا اجل نے ہائے

چھپتے پھرے وہ بیکس و مضطر کہاں کہاں

دیکھا حواس باختہ جب حر کی فوج کو ‏ ‏ ‏ جانا کہ تشنگی ہے غضب حر کی فوج کو
اپنے قریب کر کے طلب حر کی فوج کو ‏ ‏ ‏ پانی دیا امام نے سب حر کی فوج کو

برسا سحابِ رحمتِ داور کہاں کہاں

کچھ دردِ دل کا حال سناؤ تو باپ کو ‏ ‏ ‏ مرتے ہوئے گلے سے لگاؤ تو باپ کو
برچھی کہاں لگی ہے بتاؤ تو باپ کو ‏ ‏ ‏ کہتے تھے رو کے شاہ دکھاؤ تو باپ کو

کھائے ہیں زخم اے علی اکبر کہاں کہاں

ہوں بے گناہ نوحِ غریباں گواہ ہے ‏ ‏ ‏ نہ کوئی آشنا نہ کوئی خیر خواہ ہے
گرداب غم میں تیرے کرم پر نگاہ ہے ‏ ‏ ‏ سجاد کہتے تھے مری کشتی تباہ ہے

یارو سنبھالوں طوق کا لنگر کہاں کہاں

سارا زمانہ غیر ہے دشمن ہے تا بہ شرق ‏ ‏ ‏ دریا پہ یہ ستم ہوں تو تڑپے مثال برق
تو رحم کر کہ صبر و رضا میں نہ آئے فرق ‏ ‏ ‏ بابا تو سر کٹا کے ہوئے بحر خوں میں غرق

میں کھینچتا پھروں تن لاغر کہاں کہاں

دیکھے نہ یہ سنے کسی مجروح کے حواس ‏ ‏ ‏ ضربیں گلے پہ خلق تھیں ادھر کچھ نہ تھا ہراس
سوکھی زباں لبوں پہ پھرا کر بہ درد و یاس ‏ ‏ ‏ قاتل سے شاہ کہتے تھے کیوں نہ دیکھی میری پیاس

انصاف کوثر کا ترا خنجر کہاں کہاں

چلا رہی تھیں بانوئے سلطان مشرقین ‏ ‏ ‏ ہے ہے حسین، ہائے محمد کے نور عین
سر پیٹتی تھی بالی سکینہ بہ شور و شین ‏ ‏ ‏ مقتل میں شہ کی لاش پہ زینب کے تھے یہ بین

اے بھائی روئے زینب مضطر کہاں کہاں

بے دست ہے کہیں مرا عباس نام ور ‏ ‏ ‏ قاسم کہیں پڑا ہے زمیں پہ کٹائے سر

اک سوگوار خاک اڑائے کدھر کدھر — ہیں غرق خوں کہیں تو بھتیجے کہیں پسر
پیٹے سر اپنا جا کے یہ خواہر کہاں کہاں

ہوتی ہیں شہر شہر اسی غم کی مجلسیں — ہر جا ہیں نذر سرور عالم کی مجلسیں
کس جا نہیں ہیں ماہ محرم کی مجلسیں — گھر گھر بپا ہیں شاہ کے ماتم کی مجلسیں
جا جا کے روئے عاشق حیدر کہاں کہاں

ہر ذی حیات پہ ہے یہ صدمہ جہان میں — ہر عضو میں یہ درد ہے ہر استخوان میں
تن میں، رگوں میں، روح میں، لب میں، زبان میں — دل میں، جگر میں، سینۂ پرخوں میں، جان میں
ڈوبا ہے ایک غم کا یہ نشتر کہاں کہاں

جن و ملک کے دل ہیں سدا اضطرار میں — نالاں ہیں بلبلیں چمن روزگار میں
ماہی بھی مبتلا ہے اسی خار خار میں — افلاک میں، زمیں میں، ہوا میں، بحار میں
برپا ہے ایک ماتم سرور کہاں کہاں

یہ رحمتیں، یہ لطف و کرم کب ہے ابر میں — تسکیں ابھی عطا ہو جو فرق آئے صبر میں
اللہ رے اختیار، مصیبت میں، جبر میں — دکھ میں، مرض میں، نزع میں، ایذا میں، قبر میں
دیکھو مدد کو آتے ہیں حیدر کہاں کہاں

ہر جا چلی پھری سپہ اہل غدر میں — گردن میں، سر میں، شانے میں، پہلو میں، صدر میں
بالا رہی قمر سے بھی رفعت میں، قدر میں — صفین میں، حنین میں، خیبر میں، بدر میں
چمکی علیؑ کی تیغ دو پیکر کہاں کہاں

باغی کبھی نہ کرتے تھے بدعت میں، کینے میں — شاخیں نئی نکالتے تھے ہر مہینے میں
کیوں خار خار غم نہ ہو بلبل کے سینے میں — مشہد میں، کربلا میں، نجف میں، مدینے میں
بکھرے گل ریاض پیمبرؐ کہاں کہاں

کوفے میں، شام میں، حبش و زنگبار میں — خوش بو گئی جزیروں میں اور کوہسار میں
یاں ہے سواد ہند بھلا کس شمار میں — چیں میں، ختن میں، دشت خطا میں، تتار میں
مہکی شمیم کاکل سرور کہاں کہاں

نکہت وہ مشک تر کی جو تھی تار تار میں — تاروں سے پہنچی دامن ابر بہار میں
باد بہار لے کے گئی ہر دیار میں — چیں میں، ختن میں، دشت خطا میں، تتار میں

مہکی شمیم کاکل سرور کہاں کہاں

گزرے ستم جو مالک کوثر پہ دہر میں
ہے پیچ و تاب بحر کی ایک ایک لہر میں
کیوں سرخ آندھیاں نہ اٹھیں شہر شہر میں
صحرا میں، قتل گاہ میں، ریتی میں، نہر میں

ٹپکا ہے خون سبط پیمبر کہاں کہاں

ہر دم سر بریدہ تھا ایذائے سخت میں
روتا تھا خوں، فراق تن لخت لخت میں
پر تھی کسی فنا بھی صعوبت جو بخت میں
چوب سناں میں، قلعے کے در میں، درخت میں

لٹکا ہے شہ کا فرق مطہر کہاں کہاں

تھا ماہ فاطمہ پس مردن بھی سیر میں
گہہ اپنی انجمن میں، کبھی بزم غیر میں
گہہ زیر کوہ گاہ مکان عزیر میں
صندوق میں، تنور میں، زنداں میں، دیر میں

رکھا حسینؑ کا سر انور کہاں کہاں

بے پردہ شہر شہر گئے ازدحام میں
پہنچے یزید نحس کے دربار عام میں
دیکھے حدیث شک ہو جسے اس کلام میں
رے میں، دیار کوفہ میں، اقلیم شام میں

آل نبیؐ پھرے ہیں کھلے سر کہاں کہاں

لکھا ہے بنت فاطمہ کی سرگذشت میں
بیٹی منھ اپنا دیکھ کے سر شہ کا طشت میں
آنسو تھمے نہ تا بہ وطن بازگشت میں
شہروں میں، جنگلوں میں، پہاڑوں میں، دشت میں

بھائی کو روئی زینب مضطر کہاں کہاں

حال عوام جانتے ہیں صاحب علوم
جو خاص ہیں اُسی طرف ان سب کا ہے ہجوم
اکثر انیس نے یہ کہا ہے علی العموم
مونس ترے سخن کی ہوئی شش جہت میں دھوم

تیغ زباں کے پہنچے ہیں جوہر کہاں کہاں

میر انیسؔ کے نادر خطوط

دوہلی پور ضلع بنارس کے رہنے والے دو بھائیوں حکیم سید علی اور حکیم سید صادق کو میر انیسؔ سے بڑی عقیدت تھی اور میر انیسؔ کو بھی ان سے بہت محبت تھی۔ حکیم سیّد علی میر انیسؔ کے پڑھنے کی مجلسیں سننے کے لیے لکھنؤ آیا کرتے تھے۔ میر انیسؔ اور ان کے اعزّہ کی ان دونوں صاحبوں سے خط و کتابت ہوتی رہتی تھی اور وہ ان خطوط کو محفوظ کر لیتے تھے۔ مدت ہوئی میری خواہش پر میرے عزیز قریب مطلّب حسین مرحوم نے یہ خطوط حکیم سید صادق کے صاحب زادے سیّد حسن ابراہیم سے حاصل کر کے نقل کر لیے تھے۔ ان خطوط کی مجموعی تعداد ایک سو تینتالیس ہے۔ جن کی تفصیل یہ ہے:

میر انیسؔ کے ۵ (پانچ) خط، میر انسؔ کے ۸، (آٹھ) خط، میر مونسؔ کے ۳۹ (انتالیس) خط، میر نفیسؔ کے ۱۸ (اٹھارہ) خط ہیں۔ ان کے علاوہ سید محمد سلیسؔ کا ایک خط حکیم سید علی کے نام ہے اور نواب امجد علی خاں اور نواب تہوّر جنگ کا ایک ایک خط میر انسؔ کے نام ہے۔ میر انسؔ نے یہ دونوں خط اپنے خطوں کے ساتھ منسلک کر دیے تھے۔ یہ خطوط انیسؔ اور خاندانِ انیسؔ کے حالات کے معتبر ماخذ ہونے کی حیثیت سے بہت قیمتی ہیں۔ میر انیسؔ کے پانچوں خط ماہ نامہ 'آج کل'، دلی میں پہلی مرتبہ شائع کیے جا رہے ہیں۔ ان خطوں کے ساتھ میر انیسؔ کے دو خط اور بھی شائع کیے جا رہے ہیں۔ ایک مفصل خط ہے جو انھوں نے حیدرآباد سے حکیم سیّد علی کی معرفت میر مونسؔ کو بھیجا تھا۔ میر مونسؔ اس وقت دوہلی پور میں تھے۔ دوسرا مختصر خط علامہ مفتی میر محمد عباس شوستری کے نام ہے جو ان کی مثنوی مَن و سَلویٰ کی تعریف میں لکھا گیا تھا۔

میر انیسؔ کی خط نویسی کے بارے میں ایک بات کہہ دینا ضروری ہے جو مجھے

مطبوعہ آج کل نئی دہلی۔ فروری ۱۹۷۳ء۔

ایک نہایت معتبر ذریعے سے معلوم ہوئی ہے۔ میر انیس کے نواسے میر یعسوب علی مانوس اپنے نانا کے انتقال کے وقت جوان تھے اور دس برس ان کے ساتھ انھیں کے مکان میں رہ چکے تھے۔ وہ فرماتے تھے کہ میر صاحب اپنے ہاتھ سے خط بہت کم لکھتے تھے۔ کبھی خود عبارت بولتے جاتے تھے اور کوئی دوسرا لکھتا جاتا تھا اور کبھی صرف خط کا مضمون بتا دیتے تھے جس کو لکھنے والا اپنے لفظوں میں لکھ دیتا تھا۔ خط لکھنے کی خدمت زیادہ تر میر انیس کے کسی صاحب زادے کو انجام دینا ہوتی تھی۔

میر انیس اپنے خطوں میں جن لوگوں کے نام سے آداب و تسلیمات لکھا کرتے تھے، وہ اپنے تخلص سے پہچانے جاتے ہیں، اس لیے ان کے نام مع تخلص لکھے جاتے ہیں۔ میر خورشید علی نفیس، سید عسکری رئیس، میر محمد سلیس، اوصاحب جلیس۔

اس عہد کا غالباً یہ عام طریقہ تھا کہ اصل خط کے شروع یا آخر میں تاریخ تحریر نہیں لکھتے تھے بلکہ لفافے پر لکھتے تھے۔ اس لیے جن خطوں میں لفافے موجود تھے، صرف ان کی تاریخ کتابت معلوم ہو سکتی ہے۔ ان لفافوں کی عبارت سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ بنارس میں ڈاک خانہ راج گھاٹ تھا۔ میر انیس کے خطوں کے ذیل میں لفافے کی عبارت درج کرنے کے بعد خط نقل کیا جائے گا۔

خط نمبر ۱۔ دولہی پور میں حکیم میر سید علی کے بڑے بڑے باغ تھے، جن میں نہایت خوش ذائقہ آم کثرت سے ہوتے تھے۔ خاص کر لنگڑا آم ان کے باغ سے بہتر کہیں نہیں ہوتا تھا اور اسی بنا پر بنارس کا لنگڑا مشہور ہو گیا تھا۔ حکیم سید علی آموں کا تحفہ بھیجنے میں بڑے حاتم تھے۔ ہر سال میر انیس اور ان کے بھائیوں اور بیٹوں کو اور لکھنؤ کے بعض امیروں اور رئیسوں کو آموں کے کھانچے بھیجا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ ان کے بھیجے ہوئے آموں میں لنگڑا ایک بھی نہ تھا بلکہ بڑے بڑے آم تھے جو میر انیس کو پسند نہ تھے۔ انھوں نے حکیم صاحب کو بہ طور شکایت لکھ بھیجا کہ یہ بڑے بڑے آم بڑوں کے لائق تھے، راقم کے بہ جائے امجد علی خاں صاحب کے ہاتھیوں کے لیے بہت مناسب تھے۔ اس جملے میں ایک تلمیح ہے۔ شیش محل لکھنؤ کے امیر کبیر نواب امجد علی خاں نے ایک مرتبہ زیارتِ مشاہد مقدسہ کے لیے عراق کا سفر کیا۔ ان کی عدم موجودگی میں ان کے صاحب زادوں نے اُن کے ہاتھیوں کی پرداخت میں اتنی

عقلت کی کہ آموں ہاتھی مر گئے۔ جب وہ اب دوبارہ زیارت کے لیے جانے لگے تو اپنے ہاتھی مہاراجہ بنارس کے یہاں بھیج دیے اور ان کی دیکھ بھال حکیم سید علی سے متعلق کر دی۔ حکیم صاحب نے جس وقت میر انیس کو آم بھیجے اس وقت وہ ہاتھی بنارس میں موجود تھے۔

خط نمبر (۲) میں بھی حکیم سید علی کے بھیجے ہوئے آموں کا ذکر ہے۔

خط نمبر (۳) تعزیت نامہ ہے جو حکیم سید علی کی والدہ کے انتقال پر لکھا گیا تھا۔

خط نمبر (۴) سے معلوم ہوتا ہے کہ میر اشرف مسیح ولد میر باقر مسیح میر انیس کے ایک دوست تھے۔ ان کی صاحب زادی بنارس میں منسوب تھیں۔ ان کے شوہر کے انتقال کے بعد ان کے سسرالی اعزہ ان کو طرح طرح کی تکلیفیں پہنچا رہے تھے اور ان کو اپنے وطن لکھنؤ نہیں آنے دیتے تھے۔ میر انیس نے یہ سفارشی خط لکھ کر میر اشرف مسیح کے ہاتھ حکیم سید علی کو بھیجا تھا۔

خط نمبر (۵) سے معلوم ہوتا ہے کہ میر سید علی کے خلاف کوئی مقدمہ دائر کر دیا گیا تھا جس سے میر انیس کو بڑی تشویش تھی اور انھوں نے دولہی پور جانے کا ارادہ کیا تھا، مگر اسی اثنا میں میر مونس کا خط آ گیا جس سے حکیم صاحب کی فتح یابی کا حال معلوم ہوا۔

خط نمبر (۶) میں میر انیس نے حیدر آباد کے سفر، وہاں کے قیام اور وہاں سے واپسی کے حالات تفصیل سے لکھے ہیں۔

خط نمبر (۷) میں علامہ مفتی میر محمد عباس شوستری کی مثنوی من و سلویٰ کی رسید ہے۔

خط ۱۔ چاشنی بخش کام آرزوے نورس چینان تو نہال خلت وصفا زاد را فتکم۔

بعد تخم کاری اشتیاق در زمین دل اخلاص منزل بامید برخوردنی از درخت فیض صحبت سراپا برکت عرض می دہد۔ از رسیدن سبد یک صد وسی و یک انبۂ شیریں ادا میوۂ مراد منتظران بہار رسید۔ چہ گونہ شکر ایں نعمت ادا کنم کہ لب از لب جدا نمی شود۔ کوزہ نبات وقند مصری نوا اندیش نہ می توانم، چرا کہ آں سخت ادا این نزاکت و لطافت از کجا آرد۔ لب ہر کس کہ بر دہن یا قاش نازکش رسید بے نیاز از بوسۂ شیریں لباں گردید۔

انبہ ہاے بزرگ کہ سی و یک بودند چونکہ بر سر کہتران کہ زیر دست زبردستان

بودند افتاد۔ اکثر فرسودہ و ژولیدہ بودند۔ اما انبہ ہاے طبقۂ ثالث کہ ا لثالث بالخیر ہمہ محفوظ و چست و درست بودند۔ و فی الواقع کہ بعد انبۂ قسم لنگڑا انبۂ ہر دو طبقہ کہ ماء معین بُودند، بسیار شیریں و لطیف۔ سوائے لنگڑا بہتر از ایں انبہ دیگر نیست۔ ہرچہ بہ قامت کہتر بہ قیمت بہتر۔ انبۂ کلاں کہ لائق بزرگان ہستند ناپسند دگاہے لذت آشناے ایں کمترین خلائق بودہ نیست۔ بہ جاے راتب وفیلان جناب امجد علی خاں بہادر بس مناسب بُودند۔ گستاخی معاف، از خردان خطا و از بزرگان عطا۔ در خرداں کہ تلاش قسم لنگڑا نمودم، بسیار جستم کم یافتم۔ یکے ہم نبود۔ عمرت دراز باد کہ ایں ہم غنیمت است۔ زیادہ چاشنیِ عمر و حلاوتِ زندگانی روزی باد۔

بہ خدمت سراپا عنایت جناب حکیم سید صادق صاحب عرض سلام نیاز بہ صد شوق ملاقات و بہ نور چشمان دعاے عمر درازی باد۔ میر خورشید علی و میر محمد و سید عسکری عرض تسلیم می نمایند۔

حررہ عبدہ المذنب العاصی
انیس عفی اللہ عنہ

خط ۱۷۔ ان شاء اللہ العزیز خط ہذا در شہر بنارس رسیدہ آں جا بہ دہلی پور فیض گنجور بہ سخا معور بہ مطالعۂ جناب حکیم صاحب عالی شان والا دو دمان جناب حکیم سید صادق زادو رافتکم فائز باد۔

حررہ انیس

روانہ از لکھنؤ محلہ سبزی منڈی ، بیرنگ

مرقوم ہفتم ماہ حال ھوالقطبیات

[اس عبارت میں "مرقوم ہفتم ماہ حال" کے الفاظ سے لکھنے کی تاریخ تو معلوم ہو گئی مگر مہینہ اور سال معلوم نہ ہوا۔ اس لفافے پر ڈاک خانے کی جو مہریں پڑی ہوئی ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ خط ۹ جولائی ۱۸۶۸ء کو لکھنؤ سے چلا اور ۱۰ جولائی کو بنارس اور ۱۱ جولائی کو راج گھاٹ پہنچا۔ اس سے قیاس کیا جا سکتا تھا کہ یہ خط ۷ جولائی ۱۸۶۸ء کو لکھا گیا ہوگا لیکن انیس ہمیشہ عربی مہینے اور ہجری سال سے وقت کا حساب لگاتے تھے اور ان کے زمانے میں عام دستور کلی یہی تھا اس لیے بلاشبہ "ہفتم ماہ حال" سے ۷ ربیع الثانی ۱۲۸۵ھ مراد ہے کہ یہ تاریخ ساتویں یا آٹھویں جولائی ۱۸۶۸ء کے مطابق تھی۔]

جناب حکیم صاحب عالی مناقب، والا مراتب، مشفقی مکرمی دام مجدکم۔

بعد عرض سلام و اشتیاق دیدار فرحت آثار کہ مزیدے بر آں متصور نیست واضح رائے عالی می گرداند والحمد للہ کہ فقیر ہنوز جامۂ حیات بہ بردارد و برائے صحت سلامت آں محبوب القلوب و ما یتعلق بکم از جناب باری تعالیٰ مسئلت دارم۔

نامۂ نامی و صحیفۂ گرامی رجسٹری شدہ بہ تاریخ نوزدہم بہ فقیر رسیدہ، بکم و کیف مرقوم مطلع ساخت۔ ہمان وقت آدم را برا اسٹیشن لکھنؤ فرستادم۔ اسٹیشن ماسٹر گفت کہ فردا، بعد نواختن یازدہ گھنٹہ بہ بائید بہ برید۔ روز دوم کہ تاریخ بستم بود باز آدم بروقت رسید۔ وقت سہ پہر انبہ آورد۔ دیدم کہ چوب ہائے نے کہ جناب بر سبد چیدہ و بستہ بودند مع ٹاٹ بالائی از جا تو یا آری بریدہ اند۔ وقت شمار سی و شش انبہ کم شدہ و قریب بست و ہفت انبہ سیاہ و بوسیدہ و فرسودہ شدہ بودند۔ بہ عزیزان و احباب و جناب سید تقی صاحب قبلہ کہ خیلے مشتاق بودند و نواب امجد علی خان بہادر فرستادم۔ ہمہ محظوظ و یک زبان اند کہ چنین انبہ نہ خوردہ ام۔ تکلیف بسیار فرمودند۔ خانۂ احسان آباد باد۔ مردمانِ اسٹیشن لکھنؤ در صنعت سرقہ عدیل نہ دارند۔

عجب و بس عجب کہ درین مدت کدام خط مثل جناب حکیم صاحب بہ جناب ہم شفقت نفرمودند کہ خاطر متردد و نگراں بود و شکایت از حکیم صاحب بروقت ملاقات اگر خدا ہم خواستہ باشد خواہد شد۔ اگر حیات وفا می کند و صحت می ماند، امسال بعد محرم الحرام حرکت را بر سکون راجح می دانم۔ آیندہ اختیار خدا است۔ حال من این کہ یک ہفتہ ہم از صحت نمی گزرد۔ بہ خدمت جناب حکیم صاحب قبلہ عرض سلام بر صد شوق و شکایت قبول باد۔ بہ نور چشم، راحت جان اقبال نشان سید ابراہیم طال عمرہٗ دعا و دیدہ بوسی رسانید۔ بہ خدمت جناب ناصر صاحب و قبلہ عرض بندگی۔

از جانب میر خورشید علی و سید عسکری و میر محمد و ابو صاحب عرض تسلیمات بہ صد آرزوے قدم بوسی قبول باد ـــــ زیادہ چہ مکلف شود۔

خط ۴۳۔ ان شاء اللہ العزیز خط ہذا در شہر بنارس رسیدہ و از آں جا بہ دہلی پور بہ مکان حکیم صاحب بہ شرف مطالعہ جناب حکیم صاحب عالی مناقب والا مراتب جناب حکیم سید علی صاحب و جناب سید صادق صاحب زاد عنایاتکم مشرف باد۔

روانہ از لکھنؤ محلہ سبزی منڈی "بیرنگ"

[اس خط کے لفافے پر ڈاک خانے کی جو مہریں پڑی ہوئی ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ خط ۲۵ ستمبر ۱۸۸۶ء کو لکھنؤ سے روانہ ہوا اور ۲۷ کو راج گھاٹ بنارس پہنچا۔ ۲۵ ستمبر ۱۸۸۶ء کو ۲۰ جمادی الثانی ۱۳۰۳ھ تھی۔]

جناب حکیم صاحب عالی مناقب والاشان منہل عنایت و منبع رافت و احسان زاد عنایتکم غم نامۂ جاں گزا و روح فرسا کہ از ہر فقرہ اش بوے کباب دل و خون ناب جگر بہ مشام جان تیرہ بختان و سراسیمگان بہ وادیِ غموم می رسید، وصول گشتہ موجب اشتعال ذوالتہاب نوائر حسرت و اندوہ گردید۔ چہ بگویم و چہ بنویسم کہ ہر لحظہ و ہر آن از تراکم ہموم و غموم بہ چہ عنوان بسر می شود۔ گاہے خیال الطاف و اشتیاق بزرگانہ آں مرحومۂ مغفورہ مستغرق دریاے مغفرت سیلاب اشک از دیدہ رواں و گاہے تصور خیال باقی ماندگاں کہ یک جا انجامد دل در آتش حسرت بریاں۔ فریاد از نیرنگی زمان غدار کہ ہیچ ذی حیاتے فرصت دم زدن و نفس راست کردن نمی باید۔ آنچہ بردل این مہجور درین الم گذشتہ و می گزرد و سبحانہٗ تعالیٰ آگاہ است کہ لذت چشیدۂ این ماتم عظیم در روح فرسا ہستم۔ خصوصاً تصور این معنی کہ درین ماتم بر آں جناب و حکیم سید صادق صاحب چہ گزشتہ باشد بے تاب و گریان ام و عدم رسیدن خود در این سانحۂ جاں کاہ و شریک نہ بودن دریں ماتم صدمۂ دیگر۔ چہ کنند، زمین سخت و آسمان دور بہ جز مصابرت چارۂ نیست۔ چونکہ جناب خود فہمیدہ و سنجیدہ اند چیزے نوشتن حکمت بہ لقمان و ارشمیدس آموختن است۔ پابند رضاے الٰہی باشند، کہ این جہان گوراں گذشتنی و گذاشتنی است۔ ہر ذی حیات را ہمیں راہ در پیش حق سبحانہٗ تعالیٰ از فضل عمیم خود سایۂ آں جناب و سایۂ سید صادق صاحب را بر سر وابستگان خود مبسوط و مستدام دارد۔ باقی ماندہ ہاے آں مرحومہ مغفورہ را بہ دلداری و دل دہی تشفی بخش باشند۔ مکرر عرض ایں کہ بہ تصور حال سید صادق صاحب چشم من گریاں و دلم کباب است۔ از حال ایشاں دریں ماتم غفلت نہ فرمایند۔

بعد انقضاے مدت چہلم آں مرحومہ بہ پاس خاطر این فقیر سراپا تقصیر رخصت

عنایت فرمایند، کہ ایں جا آمدہ دو سہ ماہ توقف ورزندہ کہ تسلی خاطر این بجور خواہد بود و باعث تفریح و تسکین ایشان نیز خواہد شد۔ زبانی میر برکت حسین معلوم شدہ کہ علیل ہستند۔ زیادہ تر پریشان و مضطرام کہ در حالت عارضہ این کوہ الم بر ایشان افتاد۔ با ایں حال نقل و حرکت بہ جانب این دیار بہ کلبۂ فقیر ضرور۔ و استعلاج ہم ہمی جا مناسب۔ آیندہ صلاح ما ہمہ آنست کان صلاح جناب۔

برائے مرثیہ کہ ایما فرمودہ اند حاضر تا جان از جناب عزیز ندارم مرثیہ چیست۔ صورت ایں کہ دریں عرصہ از چند سال علیل ما ندم و شغل خوانندگی یک قلم ترک بود۔ گاہے توجہ جانب مرثیہ گفتن نہ داشتم۔ از اصرار بعض احباب قسم سر جناب کہ دو مرثیہ گفتہ ام کہ ہنوز بہ تمامی نہ رسیدہ۔ لیکن برائے خواندن کافی اند۔ چونکہ بہ علالت موزوں شدہ اند سرسری اند۔ مثل مرثیہ ہا کہ بہ دزدی تباہ شدند برابری نہ می توانند نمود، و خواندن ایں ہر دو مرثیہ خوانندہ را بے از من چند روز خواندن چہ عجب کہ دشوار باشد و نہ فہمد کہ این بند ہا را چہ گونہ می خوانند مرثیہ حاضر است طلب فرمایند و امتحان کنند۔

چونکہ عادت وقایع نویسی و افسانہ سنجی نہ دارم این قدر بس کہ روزے جناب صادق صاحب از این جا عازم وطن مالوف بود و من برائے رخصت نمودن جناب موصوف آں جا رفتہ بودم، از برادر مہرباں[1] ہمانجا ملاقات شدہ بود۔ و الیٰ الان باز نہ دیدہ ام و نہ ملاقات شد۔ اگرچہ از پاس حکیم صاحب انچہ بریں جبر رفت، رفت۔ خوشنودم و مشکور۔ شکوہ اندازۂ ظہوری نیست کہ بہ دعا قصہ مختصر کردہ است۔ ظاہرا مرثیۂ من شاید نہ می خوانند و مرثیۂ میر نواب[2] البتہ شنیدہ ام کہ می خوانند۔ اجمال است۔ مفصل عند الملاقات اگر مرگ فرصت خواہد داد۔ آیندہ فقیر تابع ارشاد۔ ہر چہ فرمایند بہ عمل آید۔

چونکہ مقدمہ واحد بود خطے جداگانہ بہ سید صادق صاحب نہ نوشتم۔ ایں خط بہ ملاحظہ ایشان نیز خواہد گذشت۔

از جانب سید خورشید علی و سید عسکری و سید محمد عرض آداب و تسلیم قبول باد۔

---

[1] برادر مہرباں: میر انیس۔ [2] میر نواب: مونس۔

به خدمت سید ابراہیم دعائے عمر درازی رسانند۔

خط ۲۱۔ انشاء اللہ المستعان بہ خدمت والا درجت جناب حکیم صاحب عالی مناقب والا مراتب جناب حکیم سید علی صاحب قبلہ دامت برکاتکم مشرف باد۔

محررہ انیس عفی اللہ عنہ

تاریخ بست و ششم شعبان المعظم ۱۲۸۰ھ

[اس عبارت سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ خط ۲۶ شعبان ۱۲۸۰ھ کو لکھا گیا اور خط کی عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ دستی بھیجا گیا تھا اس لیے اس کے لفافے پر ڈاکخانے کی کوئی مہر نہیں ہے۔]

جناب حکیم صاحب عالی مناقب، والا مراتب، مخزن قانون اخلاق، معدن جواہر اشفاق دامت برکاتکم۔ پس از تحفہ سلام مسنون و آرزوے ملاقات محبت مشحون کہ بہ تحریر نمی گنجد واضح خاطر والا باد للہ الحمد والمنۃ کہ ہنوز جامہ حیات مستعار در بردارم و برائے صحت و سلامتی آں جناب و ما یتعلق بکم لیلاً و نہاراً دست بہ دعا دارم۔

از رفتن برادر میر نواب طال اللہ عمرہٗ بہ سوئے عتبات عالیات کہ مفارقت رو داده صدمہ روحانی کہ لاحق حال گردیدہ قابل بیان نیست و اغلب کہ آں قبلہ را ہم مثل فقیر ملالے حاصل شدہ باشد۔ حق تعالیٰ اوشاں را مع الخیر و العافیۃ مشرف بہ زیارت فرماید۔ و باز مع الصحت مراجعت نمایند۔

و معلوم باد کہ جناب میر اشرف مسیح صاحب ولد میر باقر مسیح صاحب مرحوم کہ از عالی دودمان و یکے از دوستان فقیر اند بہ ذریعہ نمیقۂ ہذا بہ خدمت والا تشریف می آرند۔ وجہش ایں کہ دختر ایشان در شہر بنارس منسوب بود۔ بعد فوت شوہر اقرباے شوہر آں مانع آمدن لکھنؤ اند و صدمات و ملال انواع و اقسام می دہند۔ امید کہ ہمہ کیفیت و حال از زبانی ایشان سماعت فرمودہ حامی و معین باشند و از جانب فقیر بہ خدمت فیض درجت جناب تقدس مآب مستغنی عن الالقاب جناب قبلہ و کعبہ مولوی گلشن علی صاحب دام مجدہ و فیضہ عرض رسانند کہ جناب والا ہم ممد و معاون ایشان باشند و در مخلصی دختر ایشان از دست عزیزان شوہر آں سعی فرمایند،

بعید از احسان نخواہد بود۔

و بہ خدمت والائے جناب سید صادق صاحب پس از سلام شوق و تمنائے ملاقات معلوم باد کہ از استماع بے اعتدالی مزاج مبارک کہ گاہ گاہ لاحق دشمنان آن کرم فرما می شود کمال تردد لاحق حال می ماند حق تعالیٰ بہ صحت و عافیت دارد بہ حق محمد و آلہ الامجاد۔ و بر کوتاہ قلمی حقیر نظر نفرمودہ خطے علیحدہ از دست مبارک خود مع کیفیت مزاج زیب رقم فرمایند کہ باعث طمانیت خاطر گردد۔

و بہ خدمت فیض درجت جناب قبلۂ معظم و مکرم جناب ناظر صاحب تسلیم بہ خدمت سراپا افادت جناب مولوی سید تفضل حسین صاحب بندگی بہ خدمت برادر عالی اوشان سلام برسد و بہ خدمت ہمہ احباب اولوالالباب سلام قبول باد و بہ سید ابراہیم صاحب و برادرش دعاے مزید عمر و ترقی علم و جاہ برسد۔

و از جانب خورشید علی و سید عسکری و سید محمود ابو محمد و دولھا صاحب تسلیمات قبول باد۔ فقط۔

خط ۶۔ جناب حکیم صاحب عالی مناقب، دام اقبالہ۔ شفیق مکرم زاد افضالکم۔

بعد سلام و اشتیاق ملاقات کہ مزیدے برآں متصور نیست واضح رائے عالی باد الحمد للہ والمنۃ کہ حال خاکسار قرین خیریت و صحت و سلامت ذات والاصفات بہ درگاہ مجیب الدعوات مسئلت دارم۔ عنایت نامہ گرامی ہم دست جناب سید احمد مع دو دہقان گل بدن سبز دادہ رسیدہ۔ او سبحانہٗ تعالیٰ بہ ایں یاد آوریہا دیرگاہ بہ اقبال داشتہ از آفات ارضی و سماوی مصئون دارد بہ حق محمد و آلہ الامجاد۔

حال تردد و تفکر جناب از خطے کہ بہ میر خورشید علی سرفرازی بخش شدہ بود دریافت شدہ، ترددے کہ لاحق فقیر گشتہ قابل عرض و التماس نیست۔ استدعائے دعا از جناب مولانا مجتہد العصر و الزماں نمودم۔ در نماز جماعت کہ قریب دو صد آدم ظہر و مغرب مجتمع می شوند فقیر نیز بہ سبب قرب مکانی حاضر می شوم نمودم۔ ہر وقت دعائے صیانت از یں معرکہ ماند و در خانہ خرد و بزرگ در نماز پنج گانہ دعا می نمودند و نذر می نمودند۔ در مجالس نیز ہمیں حال بود کہ بعد گریہ و بکا مومنین مستدعی حفاظت جناب و جناب سید صادق بہ زبان داشتند۔

درعین شدت انتشار حال و تشتت بال خط میر محمد محسن رسیدہ از عبارت
آن نیز می ترادید کہ مقدمہ پر خوف است۔ خدا اعانت نماید۔ بے تاب شدہ خواستم
کہ روانہ شدہ شریک حال جناب باشم کہ صبح آن رقعۂ میر نواب رسیدہ کہ رفع عزیمت
فرمایند کہ خط فتح یابی رسید۔ سجدات شکر بہ درگاہ خداے بزرگ و برتر بجا آوردم
بہ تاریخ بست و ہفتم بعد مجلس خانہ کہ میر عسکری می نمایند از نذر جناب مولانا علی ابن
ابی طالب علیہ الف الف تحیۃ والسلام کہ عقدہ کشائے عالم اند فراغ حاصل نمودم۔
شکر کہ بہ خیر گذشت والا انتقام خوف بود۔ حق ہمیشہ کامیاب و سرسبز و محفوظ و مصئون دارد۔
حال ضعف و نیرنگی زمانہ اگر بہ قلم بہ دہم باعث ملال طبع سامی خواہد بود۔
التماس دعا دارم۔ در مقدمہ نقان ہاے مرسلۂ جناب این قدر مکلف ام کہ پانزدہ
روپیہ براے دو پارچہ دست میر خورشید علی بہ جناب فرستادہ بودم۔ دو نقان کہ مر
خدہ بہ چہ قیمت تیار شدہ۔ فقیر را مطلع فرمایند کہ مزد ربیت و فیما بین بندہ و
جناب امرے نیست کہ محتاج بیان باشد۔ الامر در مفصل بر نگارند۔
جناب سید صادق صاحب بعد ہزاراں ہزار اشتیاق ملاقات سلام شوق و
زیادہ چہ عرضہ دہد۔ بہ خدمت جناب سید تفضل حسین خاں صاحب و جناب ناظر
صاحب عرض نیاز و سید ابراہیم را بعد چسپانیدن بہ گلو دعائے دیدہ بوسی رسانند۔
دیگر بہ خدمت عزیزان خود و جا عرض سلام۔

حررہ انیس عفے اللہ عنہ

خط ملا۔ انشاء اللہ العزیز خط ہذا در بنارس بہ دولت سرائے حکیم میر سید علی صاحب
رسیدہ یا بہ دلہی بود رسانیدہ از آنجا بہ مطالعۂ برادر بہ جاں برابر عزیز از جان اقبال
نشان میر نواب صاحب مونس سلمہٗ اللہ تعالیٰ برسد۔
روانہ از حیدر آباد دکن محلہ منڈی میر عالم۔ بیرنگ روانہ شد۔

حررہ انیس عفے اللہ عنہ

[اس لفافے کی عبارت اور ڈاکخانے کی مہر سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ خط ۴ اپریل
۱۸۷۱ء کو حیدر آباد دکن سے روانہ ہو کر راج گھاٹ بنارس پہنچا۔]
برادر صاحب عزیز از جان بلکہ بہتر و خوشتر از ہزار جان سلمہٗ الرحمٰن۔

بعد سلام کہ گلبیت از گلشن اسلام و شوق ملاقات مسرت آیات واضح باد کہ
یوم مفارقت کہ عید اضحیٰ بود، بعد طے منازل و مراحل بہ حیدرآباد رسیدم تا چمن
ساگر کہ بجا دنی انگریز بہادر است تہور جنگ بہادر مع عزیزان خود و دیگر امرائے
عظام شہر تا آنجا استقبال نمودہ بہ ہزار شوق داخل مکان خود نمودند و آنچہ حق
مہمان داری این جاست دقیقہ فرو گذاشت نمی کنند۔ تاریخ نوزدہم این جا
رسیدہ شب بصحت گذارنیدم۔ صبح تحریک نزلہ و سرفہ شدید لاحق شدہ، شام
تپ حار لاحق شد غنودگی و ربودگی و شدائد صداع و تپ۔ شش روز برابر از
آب و طعام واقف نہ گردیدم۔ ہر وقت کہ گھلہ یا آش جو یا دیگر اغذیہ رو بہ رو می
آمد تہوع و استغراق ہلاک می نمود۔ و قتے کہ از بے ہوشی چشم وا می کردم می دیدم
کہ میر عسکری گریان اند۔ تا کجا نویسم کہ ہمیں حال تا روز اول محرم ماند۔
تاریخ اول مجمع مردمان قریب پنج ہزار آدم مجتمع بودند کہ تہور جنگ بہادر
من آمدہ گفتند کہ اگر طاقت باشد در مجلس شریک شوند کہ از برکت مجلس تخفیف حاصل
شود۔ از عجب حال زار بہ مجلس رسیدم میر محمود را برائے خواندن گفتم ایشان چند بند
خواندہ ختم کردند۔ بہ ہمیں حال برخاستہ بہ منبر رفتہ چند بند آہستہ خواندم۔ فقط تائید
سید الشہدا بود، حال مجلس دگرگوں گردید معلوم شد کہ در لکھنؤ می خوانم۔ بعد خواندن
تمامی مجلس کہ از امرا و اہل خلاف مملو بود بر قدم افتادند۔ از آں روز در شدت
تپ ہفت روز برابر خواندہ ام۔ تمامی حیدرآباد شہر بسیار بزرگ و آبادی این جا
نہایتے ندارد خدا بہتر می داند۔ لیکن ہر روز از ہفت ہشت ہزار آدم کم نہ بودند۔ د
حال مجلس روز نہم چہ نویسم۔ افسوس جائے شما خالی بود۔ ہر روز جہاد می نمودم۔ لذ
سہ پہر باز تپ لاحق می شد۔ تمام شب بے ہوش می ماندم۔ و حال نقاہت چنان است
کہ مشی دو قدم بر من دشوار است۔ بعد محرم نیز صحت کامل نہ دارم، و ہر روز قاصد
روانگی از این جا ہستم۔ لیکن مردمان نمی گذارند، و مرا ہر ساعت برابر ہزار سال
است و از ہمہ بیزارم۔ باعث توقف بنا چاری این شد کہ مختار الملک بہادر قصد
مجلس نمودن میدارند۔ لیکن بہ سبب ضعف و سرفہ کہ ہنوز شدت دارد انکار محض
نمودم۔ حالا می گویند کہ از من ملاقات نمودہ بروند۔ بجائے خود در دربار می گویند کہ

رفتن ایشاں ازیں شہر قبول ندارم۔ این خبر را شنیدہ بر خود می لرزم کہ حاکم است مِن
بہ سبب زندگی خود از نفع دست بردارم۔ مکرر گفتہ فرستادہ ام کہ من جلد حاضر شدہ در ماہ
شعبان ملازمت حاصل خواہم نمود کہ حالا بہ سبب عوارض گوناگوں طاقت نشستن نہ دارم
اگر خدا می خواہد و سید الشہدا مدد می فرمایند جلد روانہ می شوم۔ نزد خود تاریخ بستن قرار دادہ
ام۔ آئندہ اختیار خدا است۔ نمی خواہم کہ زندہ ازین شہر بیرون شوم۔ و در راہ ہر چہ شود بہتر
است۔ راہ نیز صعب و دشوار است و من چناں ناتواں ام کہ بیان آں نمی توانم کہ کنم۔
تقدیر ہر جا ہمراہ است۔ یک خط شما رسیدہ بود، لیکن معرا از احوال آں جا۔ نہ حال مجالس
نہ دیگر حال نوشتند۔ یک دو خط میر خورشید علی ہم رسیدہ اند۔ من تا حال بہ سبب ضعف کدام خط
بہ نام اوشان نہ نوشتہ ام کہ طاقت نوشتن ہمگی حال ندارم۔ دعا نمایند کہ ازین شہر نجات یابم و
جان خود بہ سلامت برم (عجب زمین و امن گیر د ہواے ناقص کہ از پورب بدتر، و
غذاے ایں جا بسیار خوب) وقت ملاقات اگر زندہ رسیدم بیان خواہم کرد، باقی ضعف
مانع۔ بہ خدمت حکیم میر سید علی صاحب بعد عرض سلام و شوق ملاقات باید گفت کہ گردش
فلک را ملاحظہ فرمایند کہ از کجا تا کجا رسانیدہ در ہلاک شدن بہ ایں غربت ہیچ باقی
نہ بود و ہنوز مطمئن نیستم۔ بہ خدمت سید صادق صاحب عرض سلام۔

حررہ انیس عفی اللہ عنہ

خط بہ قبلہ و کعبہ خلوص کیشاں دام ظلکم العالی۔

زبان این کج مج بیان را چہ یارا کہ مدح این اشعار آبدار نماید۔ الحق کہ دریں
جز و زمان طرز اعجاز طرازی و سحر پردازی بر ذات فیض آیات ختم گردیدہ۔

موقلم بودہ است گوئی کلک معجز سلک تو
صفحۂ قرطاس را کردی نگارستان چیں

از عین الکمال نگاہ داشتہ سایۂ ہما پایہ را بر مفارق خادمان خلوص مبسوط
دارد بہ حق محمد و آلہ الامجاد۔[1]

---

[1] سوانح عمری مفتی میر محمد عباس موسوم بہ تجلیات صفحہ ۱۸۹۔